امیر خسرو

سید غلام سمنانی

قومی سوانح حیات کا سلسلہ

امیر خسرو

امیر خسرو

سید غلام سمنانی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ نئی دہلی

1985 (ساکا 1906)

© سیّد غلام سمنانی

AMIR KHUSRAU (Urdu)

قیمت : 9.75

PUBLISHED BY THE DIRECTOR, NATIONAL BOOK TRUST
INDIA, A-5 GREEN PARK, NEW DELHI-16 AND PRINTED
AT J K OFFSET PRINTERS 315, JAMA MASJID DELHI-6

سخنہائے گفتنی

امیر خسرو کے متعلق انگریزی میں میری کتاب جس کی ضخامت ۸۰ صفحے تھی، ۱۹۶۹ء میں "نیشنل بک ٹرسٹ" نے نیشنل بایوگرافی سیریز میں شائع کی تھی۔ اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد اس کا ہندی اور پنجابی ترجمہ بھی منصۂ شہود پر آگیا۔ دیگر علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ توقع تھی کہ اردو ترجمہ بھی جلد ہی اشاعت پذیر ہوگا لیکن بوجوہ ایسا نہ ہوسکا، یہ معاملہ تعویق والتوا میں پڑتا گیا اور اس پر کم و بیش دس سال کا عرصہ گزر گیا، بالآخر مجھ سے خواہش ظاہر کی گئی کہ میں خود ہی اردو میں اس کا ترجمہ بھی کروں، میرے لیے سوا تعمیل کے اور کوئی چارہ نہ رہا اور میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اس دس گیارہ سال کی مدت میں امیر خسرو پر بہت سے تحقیقی مواد اور معلومات مختلف زبانوں میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس برِ صغیر میں اس بیچ میں امیر خسرو کی برسی بھی منائی گئی اور اس موقعہ پر بھی مضامین و مقالات، کتب اور جرائد و رسائل کے خاص نمبروں کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی جنھوں نے خسرو شناسی کی راہ کی بہت سی ناہمواریوں کو دور کر دیا۔ میری نظروں میں یہ سارا مواد تھا اور وہ تنقیدیں اور تبصرے بھی تھے جو انگریزی کتابچہ کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے: محولہ انگریزی کتابچے میں چند مصالح کے پیشِ نظر جو خامیاں رہ گئی تھیں وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ تھیں، میں نے ترجمہ کرتے وقت ان سارے مواد سے پورے طور پر استفادہ کیا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس اردو کتاب کا حجم اصل انگریزی کتاب سے بڑھ گیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب انگریزی کتابچہ کا لغوی ترجمہ نہیں بلکہ اُردو میں علاحدہ ایک تصنیف ہے۔

بطور اعتذار ایک بات اور عرض کر دوں — یہ کتاب آج سے تقریباً ایک سال قبل ہی

قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی اگر اس دوران میں میں پیہم دو روح فرسا حادثوں سے دوچار نہ ہوتا۔ حادثے ہمیشہ غیر متوقع ہوتے ہیں اور ان سے کسی کو کوئی مفر نہیں۔ ان حادثوں نے کچھ دنوں کے لیے میرے قوائے فکر و عمل کو بالکل معطل کر کے رکھ دیا، جس کی وجہ سے اس فرض کی ادائیگی مؤخر ہو گئی۔ میں بہر حال اس تاخیر کے لیے سراپا معذرت ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قارئینِ کرام عفو و درگزر سے کام لیں گے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے کرم فرما گرامی قدر الیس۔ اے رحمان صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں۔ موصوف نے اس دوران بڑے صبر و تحمل سے کام لیا اور مجھے اس بات کا پورا موقعہ دیا کہ میں اس فرض کو بحسن و خوبی انجام دے سکوں۔

سید غلام سمنانی

شعبۂ انگریزی، ذاکر حسین کالج (شبینہ)
دلّی یونیورسٹی، اجمیری گیٹ، دلّی۔ ۱۱۰۰۰۶

۱

امیر خسرو کی ولادت تو سلطان ناصر الدین کے دورِ حکومت میں ہوئی لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کا زمانہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکمرانی ہے۔ بلبن صرف ایک صاحب سیف ہی نہیں تھا جو میدان جنگ ہی میں داد شجاعت دیتا رہتا، اندرون ملک قیام امن و آشتی کی کوششوں میں مصروف رہتا اور ملک کی سالمیت و آزادی کو برقرار رکھنے میں منہمک رہتا بلکہ وہ صلحا و علما سے بھی محبت کرتا اور ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جن ممتاز شخصیتوں سے بلبن کے بہت قریبی مراسم تھے ان میں مولانا برہان الدین محمود، نجم الدین عبد العزیز، شیخ سراج الدین ابو بکر، مولانا برہان الدین بزاز، قاضی رکن الدین سامانوی، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا شمس الدین خوارزمی اور مولانا فخر الدین نائب تھے، اگرچہ بلبن خود کوئی عالم نہیں تھا لیکن اس کی شخصیت پر ان صاحبان فضل و کمال کے نقوش مرتسم تھے۔

بلبن کو صلحا اور علما سے اس قدر اشتغال تھا کہ وہ شعرا کی طرف زیادہ توجہ مبذول نہ کر سکا لیکن جو کوئی بھی اس کے دربار میں باریابی حاصل کر لیتا اور اس کی مدح و ستائش کرتا وہ انعام و اکرام سے محروم نہ رہتا، مزید براں یہ کہ اس کی اس کوتاہی کا بدل اس کے شہزادے اور امرا شعرا کی سرپرستی کی شکل میں کر دیا کرتے تھے۔ اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ صلحا اور علما سے اپنی وابستگی کے باوجود وہ شعر و سخن کی حوصلہ شکنی نہ کرتا تھا۔

اس کا سب سے بڑا لڑکا شہزادہ محمد جو خان شہید بھی کہا جاتا ہے، شعرا کا بہت بڑا سرپرست تھا، شمس دبیر، قاضی اثیر، امیر خسرو اور امیر حسن سنجری نے اس کی شان میں قصائد کہے، شہزادہ محمد کو شاعری سے اتنا انہماک تھا کہ اس کے ارد گرد شعرا کی بزم سجی رہتی تھی، جس وقت منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور لاہور، دیبال پور اور ملتان کو تاخت و تاراج کر دیا تو شہزادہ محمد میدان جنگ میں ان سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا، اس وقت شعرا نے اس کی یاد میں

مرثیے لکھے۔ امیر خسرو اور امیر حسن سنجری اس موقعہ پر موجود تھے۔ امیر خسرو نے مرحوم شہزادہ کی یاد میں کئی ایک مرثیے لکھے، ان میں سے پہلا مرثیہ گیارہ بند پر مشتمل ہے اور ہر بند میں بارہ اشعار ہیں، شہزادہ کی اس ناگہانی موت پر اظہار غم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید   آفت است ایں یا قیامت درجہاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد   برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں از چار سوئے   پنج آب دیگر اندر مولتاں آمد پدید

— — — — — — — — — — — — —

تا چہ طالع بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید   تیغ کافر کُش، برائے کشتن کافر کشید

— — — — — — — — — — — — —

انچہ حاضر بود لشکر، لشکر دیگر بجست   زانکہ رُستم را نہ شاید منّت لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن، بداں قوت کہ داشت   بے محابا خشم در سر کرد و رایت بر کشید
آنچناں رنگین کنم امسال خاک از خون شان   کز زمین باید شفق را گونۂ احمر کشید
او دریں تدبیر و آگہ نہ کہ تقدیر فلک   صفوۂ تقدیر را خط مشیت در کشید

آں چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
جوق جوق از آب بگذشتند و ناگہ دررسید۔

ترجمہ:۔ یہ حقیقت حال ہے یا کوئی بلا آسمان سے ظاہر ہوئی، یہ کوئی آفت ہے یا دنیا میں قیامت برپا ہو گئی؟

دوستوں کی بزم اس طرح سے منتشر ہو گئی جیسے ہوا سے پھول کی پنکھڑی، گویا کہ باغ میں خزاں کا موسم آگیا۔

چاروں طرف ایک دنیا کی آنکھوں سے اس طرح آنسو بہنے لگے گویا کہ ملتان میں ایک دوسرا پنجاب پیدا ہو گیا۔

— — — — — — — — — — —

وہ کونسی منحوس گھڑی تھی کہ بادشاہ نے ملتان سے لشکر کشی کی اور اس نے اپنی کافر کش تلوار کو کافر کو مارنے کے لیے کھینچا۔

— — — — — — — — — — —

جتنا لشکر موجود تھا اُس نے اُسی پر اکتفا کی۔ مزید کمک نہ چاہی کیونکہ یہ رستم کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ فوج کا ممنون ہو۔

جب اس کو دشمن کی قوت کی خبر دی گئی تو اس کو غیظ آگیا اور اس نے علم بلند کر دیا۔

(اور اس نے سوچا کہ) اس سال میں دشمن کے خون سے زمین کو اس طرح رنگین کروں گا کہ شفق اس سے سرخی حاصل کرے گی۔

وہ تو اس خیال میں تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ کارپردازان قضا و قدر نے اس کی تدبیر کے صفحہ پر خدا کی مرضی کا خط کھینچ دیا ہے۔

وہ کونسی ساعت تھی کہ کافر لشکر کے سر پر آپہنچے، گروہ در گروہ انھوں نے دریا کو عبور کیا اور دفعتہً ٹوٹ پڑے۔

یہ اشعار خسرو کی اُس وابستگی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں جو انھیں شہزادہ محمد سے تھی، ان میں صرف شاعر کی تخیل کی پروازہی نہیں ہے بلکہ ان کا ہر لفظ سوز و گداز، درد و غم اور حسرت و یاس کا مرقع ہے۔ خسرو کے دوست امیر حسن سنجری نے بھی نثر میں شاہزادہ محمد کی ناگہانی موت کا یوں ماتم کیا ہے:

"ہم در عین ایں عنا و اثنائے ایں آشوب بلا، ناگاہ تیرے از شست قضا بر بال آں شہباز فضائے عزا رسید و مرغ روح از قفس قالب آں حضرت بجانب گلشن و روضۂ رضوان نقل کرد، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، ہماں زماں پشت دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم چوں دل یتیماں زار بشکست و سد ملت احمدی صلی اللہ علیہ وسلم چو گور غریباں پست بیفتاد و اعضائے کہ بازوئے ملک را بود از دست بشد"

ترجمہ : اس قہر کے دوران اور اس بلا کے درمیان ناگاہ تقدیر کے ترکش سے ایک تیر جنگ کی فضا کے اس شہباز کے بازو پر پڑا اور اس کی روح کا طائر اس کے جسم سے جنّت کے باغ کی طرف پرواز کر گیا۔ بیشک ہم خدا کے لیے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف واپس جانے ہیں، اسی وقت دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت یتیموں کے دل کی طرح ٹوٹ گئی اور اسی وقت ملت احمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی فصیل مسافروں کی قبر کی طرح بیٹھ گئی، ملک کے بازو کی قوت ختم ہو گئی۔

ہم عصر مؤرخ مولانا ضیاء الدین برنی نے خسرو اور امیر حسن دہلوی دونوں ہی کو شہزادہ محمد کا ماتم

کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر اُن کے بخت نے یاوری کی ہوتی تو شہزادہ زندہ رہتا اور بلبن کے بعد تخت و تاج کا وارث ہوتا۔ خسرو کا مرثیہ منظوم اور حسن دہلوی کا مرثیہ منثور دونوں ہی شہزادہ کی ناگہانی موت پر اُن کے گہرے غم کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں ہی کے نزدیک وہ شعر و سخن کا سرپرست اور دلدادہ تھا لیکن افسوس وہ بہت مختصر زندگی لے کر آیا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ زندہ رہتا اور اس کو اپنی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کا موقعہ ملتا تو ہندوستان میں ادبیات فارسی کی تاریخ کا ایک دوسرا رخ ہوتا۔

غلام بادشاہوں کا زمانۂ حکومت شعرا اور علما کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا، انھیں نغمہ سرائی اور زمزمہ سنجی کی پوری آزادی حاصل تھی اور وہ اپنی محسوسات کا برملا اظہار کرتے تھے، اس سلسلہ میں امیر خسرو بہت زیادہ خوش بخت تھے اور نتیجہ میں انھیں آنے والی نسلوں کی تحسین و توصیف حاصل ہوئی۔

ابوالحسن یمین الدین خسرو[1] جو بعد میں امیر خسرو کے نام سے معروف ہوئے، ۱۲۵۳ء (۶۵۱ھ) میں بمقام مومن پور (موجودہ پٹیالی) ضلع ایٹہ (یوپی) پیدا ہوئے۔ داراشکوہ نے اپنی کتاب "سفینۃ الاولیار" میں اس قصبہ کا نام "مومن آباد" لکھا ہے۔ اپنے والد امیر سیف الدین محمود کے بارے میں خسرو یوں رقمطراز ہیں:-

> "میرے والد شمسی (شمس الدین التمش سے وابستہ ہونے کی وجہ سے) اس روشنی کے سبب جو ان کی پیشانی پر تھی تیغ خورشید تھے اور صف شکنی میں انھوں نے ایک اچھی شہرت حاصل کر لی تھی"[2]

امیر سیف الدین ترک تھے اور ان کا تعلق ہزارہ قبیلہ سے تھا، بارھویں صدی عیسوی میں منگولوں نے پوری اسلامی دنیا کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ انھوں نے خلافت عباسیہ کے جاہ و حشم کو خاک

---

[1] ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، استاد دانشگاہ تہران نے اپنے کتابچہ "امیر خسرو دہلوی" میں امیر خسرو کا نام "امیر ناصرالدین ابوالحسن خسرو" لکھا ہے لیکن تذکرہ نگاروں اور مورخوں کا اتفاق اس نام پر نہیں ہے۔ (مصنف)

[2] دیباچہ غرۃ الکمال، "پدرم شمسی کہ از نور پیشانی تیغ آفتاب بود و بصف شکنی اشتہار یافتہ"

میں ملادیا اور بغداد جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا دھڑکتا ہوا دل تھا، یکسر تباہ و برباد ہوگیا۔ ہر سمت دہشت و بربریت کی حکمرانی تھی اور کوئی بھی اس قہر کی زد سے محفوظ و مامون نہیں تھا، امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی انھیں لوگوں میں سے تھے جو اس آشوب قیامت میں بے خانماں ہو گئے تھے۔ تاریخ عالم کے اس موڑ پر جب بلخ بھی جو قبۃ الخضرا کہا جاتا تھا زمین بوس ہو چکا تھا، ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں یہ خانماں برباد لوگ سکون سے زندگی بسر کر سکتے تھے، چنانچہ امیر سیف الدین محمود بھی ہندوستان آکر دلّی میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اس وقت سلطان شمس الدین التمش تخت دلّی پر متمکن تھا۔ امیر سیف الدین کو دربار شاہی میں رسائی حاصل ہوگئی۔ مؤرخین نے اس امر پر تو روشنی نہیں ڈالی ہے کہ امیر سیف الدین دربار شاہی سے وابستہ ہونے کے بعد کس مرتبہ پر فائز ہوئے لیکن یہ بات تو کم از کم مسلّم ہی ہے کہ ان کو کوئی نہ کوئی معزز عہدہ عطا کیا گیا تھا، پھر انھیں قصبہ پٹیالی میں جاگیر دے دی گئی، پھر امیر عماد الملک کی صاحبزادی دولت ناز سے ان کی شادی بھی ان کے صاحب حیثیت ہونے کا ثبوت ہے۔ خسرو نے بھی ان کی پاکبازی اور مہر و مروّت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

> " وہ اس دنیا میں بھی امیر تھے اور آخرت میں بھی، انھیں اُمّی ہونے کا بھی شرف حاصل تھا[1]"

ایک دوسری جگہ پر التمش کی تعریف کرتے ہوئے وہ اپنے والد کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

جہاں بقوت او می گرفت التمش
کہ برکشید خدایش بقبضۂ قدرت

(التمش ایک ایسے شخص کی قوت و ہمت سے دنیا پر فتح حاصل کرتا تھا جس کو خدا نے اس سے چھین لیا۔)

برنی کے قول کے مطابق امیر سیف الدین محمود کو شاہی خزانہ سے دس ہزار تنکہ سالانہ ملا کرتے تھے۔

عماد الملک کی صاحبزادی سے امیر سیف الدین کے تین لڑکے پیدا ہوئے (۱) عزالدین علی شاہ (۲) ابوالحسن یمین الدین خسرو اور (۳) حسام الدین قتلغ، کہتے ہیں کہ خسرو جب پیدا ہوئے

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال : " ہم از طریق دنیا امیر بود و ہم از جانب عقبیٰ صاحب ولایت بود باآنکہ اُمّی بود"

تو ان کے والد انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مرد درویش کے پاس لے گئے۔ انھوں نے دیکھنے کے ساتھ ہی یہ الفاظ کہے :

" آوردی کسے را کہ دو قدم از خاقانی بیش خواہد بود "[1]

(تم میرے پاس ایسے کو لائے ہو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے ہوگا)

جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انھیں پڑھنے کے لیے مکتب میں بھیجا گیا، اگرچہ امیر سیف الدین محمود خود پڑھے لکھے نہ تھے اور ان کا تعلق ایک جنگ جو نسل سے تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا مخصوص و معقول بندوبست کیا تھا۔ خسرو نے خواجہ سعد الدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے انھوں نے علم خطاطی حاصل کیا لیکن ان کے اپنے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر و سخن کے سائے اُن پر بچپن ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ اپنے استاد خواجہ سعد الدین کے ساتھ خواجہ اصیل کوتوال کے گھر گئے، وہاں اُن کی ملاقات ایک زبردست عالم خواجہ عزالدین سے ہوئی جو وہاں مقید تھے۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو خواجہ موصوف کے ہاتھوں میں کوئی کتاب تھی۔ خواجہ سعد الدین نے خسرو کا تعارف اپنے شاگرد کی حیثیت سے خواجہ عزالدین سے کرایا اور یہ بھی کہا کہ یہ بچہ شعر بڑے اچھے ترنم سے پڑھتا بھی ہے۔ یہ سُن کر خواجہ موصوف نے وہ کتاب خسرو کو دی اور اس میں سے چند اشعار پڑھنے کی فرمائش کی۔ خسرو نے تعمیل ارشاد کی۔ خواجہ موصوف نے بڑی تعریف اور تحسین کی۔ خواجہ سعد الدین نے خواجہ عزالدین کو خسرو کے ذوق شعر گوئی کے متعلق بھی بتایا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس بچہ کا امتحان لیا جائے کہ یہ کس حد تک شاعری کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ خواجہ موصوف نے درج ذیل چار غیر متعلق چیزوں کا نام لیا اور کہا کہ ان کو اس طرح نظم کرو کہ ان کا باہمی تناقض دور ہو جائے۔

مو، بیضہ، تیر، خربزہ

تھوڑی دیر بعد خسرو نے یہ قطعہ سنایا ؎

برموئے کہ در دو زلف آں صنم است　　صد بیضۂ عنبریں برآں موئے صنم است
چوں تیر مدان راست دلش را زیرا کہ　　چو خربزہ دندانش میان شکم است

---

[1] سیر الاولیا : امیر خورد

(اُس صنم کی دونوں چوٹیوں میں جو بال ہیں اُن میں سیکڑوں بیضۂ عنبریں ہیں۔ اس کے دل کو تیر کی طرح سیدھا نہ سمجھو کیونکہ خربوزے کی طرح اس کے دانت بھی پیٹ کے اندر ہیں)

خواجہ موصوف کو ان فی البدیہہ اشعار پر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے خسرو کی بڑی ہمت افزائی کی، جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد دربارِ شاہی سے وابستہ ہیں تو انھوں نے خسرو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا تخلّص "سلطانی" رکھیں۔ خسرو نے اس مشورہ کو قبول کیا اور انھوں نے اپنے دیوان "تحفۃ الصغر" کی بیشتر غزلوں میں یہی تخلّص استعمال کیا ہے[1]۔

اس طرح خسرو تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی و قدرشناسی کے درمیان زندگی کے مراحل طے کرنے لگے لیکن اس کم عمری میں جب وہ مشکل ہی سے اپنا کوئی نقش مرتسم کر پائے تھے انھیں ایک گہرا زخم لگا، ان کے والد منگولوں سے نبرد آزمائی میں شہید ہو گئے۔ اس عمر میں جب انھیں مسکرانا اور ہنسنا چاہیے تھا انھیں زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے کاری زخم کا تجربہ ہوا، خسرو نے ایک نقش پذیر ذہن اور ایک حساس دل پایا تھا، آنے والے دنوں میں انھوں نے اپنے اس شدید غم کا اظہار اس شعر میں یوں کیا ہے:

سیف از سرم برفت و دل من دو نیم ماند　　　دریائے من رواں شد و دُرِ یتیم ماند

(تلوار میرے سر سے گزر گئی اور میرا دل دو ٹکڑے ہو گیا، میرا دریا رواں ہوا اور موتی تنہا رہ گیا)

والد کی بے وقت موت نے خسرو کو شدید تنہائی اور زبردست احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا لیکن ان کے نانا عماد الملک نے بڑی محبّت و شفقت سے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ عماد الملک خود بھی بڑی اہم اور با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ عماد الملک کے وفورِ محبت و شفقت نے خسرو کے زخمِ محرومی کو بہت حد تک مندمل کر دیا اور انھیں اپنی راہ خود نکالنے کا اچھا موقع ملا۔ انھوں نے شعر و سخن کی راہ پر چلنا شروع کیا اور بالآخر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔

جب خسرو کی عمر بیس سال کی ہوئی تو ان کے نانا ایک سو تیرہ سال کی عمر میں رحمتِ حق سے جا ملے۔ ایک بہت ہی پُر اثر مرثیے میں خسرو نے اپنے نانا کی موت کا ماتم کیا ہے جس کی محبّت

---

[1] دیباچہ تحفۃ الصغر از امیر خسرو

اور شفقت ہی کی وجہ سے وہ خسروِ اقلیم شعر و سخن ہوئے۔

> ” وہ چراغ بجھ گیا، آسمان کی شمع تاریک ہوگئی، افسوس! کونین کی بنیاد منہدم ہوگئی، کیا بات ہے کہ عارض دربار شاہی میں نہیں جا رہا ہے؟ وہ وزیر باتدبیر کہاں روپوش ہوگیا؟ اور دیوان کے پاس کیوں نہیں آرہا ہے؟ . . . .
>
> . . . . اے آصف! سلطان بھی تیرے لیے رو رہا ہے اور دیوان بھی تیرا ماتم کر رہا ہے، اس سماوی گنبد کا ستون گر گیا کیونکہ قصر شاہی کے بام و در ماتم کر رہے ہیں . . . .
>
> . . . . . . ترکوں نے اپنی کلاہیں اتار دی ہیں اور وفور غم میں اپنی عباؤں کو گریباں سے دامن تک چاک کر ڈالا ہے، دوسری طرف ہندو رئیس برہمنوں کی طرح برہنہ سر درد و غم سے بے قرار رو رہا ہے “

اس وقت تک خسرو کو شاعر کی حیثیت سے کچھ شہرت حاصل ہو چکی تھی، ان کے نانا کی موت نے اس ناتجربہ کاری کے عالم میں اُن پر کچھ ایسی ذمہ داریاں ڈال دیں جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ خسرو ایک شاعر کی حیثیت سے روشن مستقبل کے مالک تھے ” اس زمانے کی روایت کے مطابق اب انھیں ایک قدر شناس اور سخن فہم سرپرست کی ضرورت تھی جس سے وہ وابستہ ہو سکتے۔

انھیں ایسی شخصیت علاء الدین کشلی خاں الغ قتلغ مبارک باربک میں نظر آئی، اُسے عام طور پر ملک چھجو کہا جاتا تھا، وہ غیاث الدین بلبن کا بھتیجا تھا اور اپنے جود و سخا میں بہت مشہور تھا، وہ ارباب علم و فضل اور اہل شعر و سخن کا بڑا قدرداں تھا اور انھیں انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا، وہ اپنی ہردلعزیزی کی وجہ سے بادشاہ کا بھی محسود ہوگیا تھا، کہتے ہیں کہ ایک بار کسی شاعر نے اس کی شان میں قصیدہ پیش کیا، وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے اپنے اصطبل کے سارے گھوڑے اس شاعر کو بخش دیے۔ چونکہ وہ ایک بااثر شخصیت کا مالک تھا اس لیے خسرو نے اپنے سرپرست کی حیثیت سے اسی کو مناسب سمجھا اور انھیں پورا یقین تھا کہ اس کے سایۂ جود و کرم میں ان کی شاعرانہ صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور بارآور ہوں گی۔

کشلی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہونے کے پہلے خسرو نے اپنے چند معاصرین کی شان میں قصیدے لکھے تھے، ان ممدوحین میں شمس الدین دبیرؔ، امیر علی سرجندار، اختیار الدولہ حسام الدین اور عماد الملک کے لڑکے اور وارث ملک محمود تھے۔ لیکن بالآخر انھوں نے کشلی خاں کو اپنے سرپرست کی حیثیت سے منتخب کیا۔ خسرو جیسے باصلاحیت اور صاحب استعداد انسان کو اپنے مصاحبین کے

زمرے میں شامل کر کے کشلی خاں کو بھی فخر محسوس ہوا۔ خسرو اس کی مدح یوں کرتے ہیں :

صبح راگفتم کہ خورشیدت کجاست آسماں روئے ملک چھجو نمود

(صبح سے میں نے پوچھا کہ تیرا سورج کہاں ہے ؟ آسماں نے ملک چھجو کا چہرہ دکھا دیا)

خسرو، کشلی خاں کی سرپرستی میں صرف دو سال رہے اور اس اثنا میں وہ اُس کے جود و سخا سے مستفید ہوتے رہے، لیکن دو سال بعد انھیں اس سے علاحدہ ہونا پڑا۔ اس علاحدگی کے اسباب خسرو خود یوں بیان کرتے ہیں :

”ایک دن بادشاہ کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، خان اعظم کشلی خاں کے یہاں بطور مہمان آیا جو اس کا برادر عم زاد تھا، اس کی یہ آمد صیغۂ راز میں تھی کیوں کہ ان کی اس طرح کی محفل عیش و نشاط کی خبریں بادشاہ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شہزادے کے ساتھ اس کے اپنے مقربین بارگاہ بھی تھے ان میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ ان دو صاحبان علم کی موجودگی قران السعدین کی حیثیت رکھتی تھی یا مہر و ماہ کا اتصال تھا اور میں جس کی حیثیت عطارد کی تھی اس محفل میں بہت محظوظ ہوا۔ اپنے طور پر ان دونوں نے اقلیم شعر و سخن پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی کوشش کی اور جواباً میں نے ساز سخن کو اس طنطنہ سے چھیڑا کہ وہ مجھے زیر نہیں کر سکے، دونوں طرف سے جو غوغائے شاعری برپا ہوا اس نے دونوں شہزادوں اور ان کے مصاحبوں کے کان کھول دیے اور جب شعرا اپنا کلام سنا رہے تھے تو ان کا سحاب فیض اس طرح جھوم کر برسا کہ اس نے سطح زمین کی ہر چیز کو نم کر دیا، حیرت انگیز زر پاشی ہوئی، دیکھنے والوں کی نگاہیں دیناروں کو دیکھ کر زرد ہو گئیں اور ان کا دامن قبا سونے کے بوجھ سے گلاب کی مانند تار تار ہو گیا۔ میرے شیریں اشعار بغرا خاں کو اتنے پسند آئے کہ انھوں نے اس جود و سخا کے پیش نظر جو بادشاہوں اور شہزادوں کی خصوصیت ہے یہ حکم دیا کہ ایک طباق بھر کے چاندی کے تنکے ان کی طرف سے بطور عطیہ مجھے پیش کیے جائیں اور اس فیاضانہ عطیہ سے انھوں نے مجھے اپنا احسان شناس غلام بنا لیا۔“

”ہمارا خان بہر حال بہت حاسدانہ مزاج رکھتا تھا اور فوراً ہی اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار رونما ہوئے، میں نے اس کو دیکھا اور سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اس نے میری کسی بات پر بھی توجہ نہ دی، اس واقعے کو کئی دن ہو گئے لیکن اب

> تک اس کے ذہن سے پچھلے واقعات کی یاد محو نہیں ہوئی۔ وہ مجھے سزا دینا اور اپنے ناوک غیظ و غضب کا ہدف بنانا چاہتا تھا، جب میں نے اس ناوک کے بارے میں سوچا تو میرا دل بہت سہما (اور میں نے یہی بہتر سمجھا کہ بھاگ کر اپنی جان بچاؤں) چنانچہ میں ایک تیر وجستہ کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔"

اس طرح کشلی خاں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے اور تعلقات کی مزید ناخوشگواری کے خوف سے خسرو بغرا خاں کی پناہ میں سامانہ چلے گئے۔ بغرا خاں نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے منصب میں اضافہ کیا۔ خسرو نے بھی اس کی مدح و ستائش میں قصیدے لکھے۔ اگر بغرا خاں اپنے والد کے ساتھ ایک مہم پر لکھنوتی نہ جاتا تو خسرو اس کے ساتھ رہتے۔ خسرو کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ اپنے امرا کے واسطے سے بغرا خاں نے خسرو کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور بلبن کے ساتھ دلی واپس چلے آئے۔

بلبن فتحمند ہو کر واپس ہوا تھا اور دلّی کے لوگوں نے اس فتح کی تقریب میں خوشیاں منائیں، فتحمند سلطان کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کیے گئے۔ اس فتح کی خبر پاکر شہزادہ محمد قاآن جو بادشاہ کا خلف اکبر تھا اور ملتان کی گورنری پر مامور تھا اپنا ارمغان تبریک پیش کرنے کے لیے خود حاضر ہوا۔ خسرو اپنی اور اس کی ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> "اُس زمانے میں معز خاں عظیم قاآن ملک بھی دام (؟) کی فتح کے بعد دلّی آیا ہوا تھا اور چوں کہ میری قسمت کو اس سے وابستہ ہونا تھا اس لیے اس نے از روئے لطف میرے سخن کے ثمروں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں تازہ کہے ہوئے چند اشعار ان کے پاس لے گیا، شہزادہ نے ان کی بڑی ستائش کی اور مجھے ایک خلعت اور کلاہ عطا کی"

شہزادہ نے خسرو سے اپنے ساتھ ملتان چلنے کے لیے کہا، خسرو کے سامنے سوا اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس کے حکم کو مانتے اور بقول خسرو انھوں نے اپنی کمر میں خدمت کا پٹکا باندھا اور رفاقت کی کلاہ کو سر پر رکھا، صرف خسرو ہی نہیں بلکہ ان کے دوست امیر نجم الدین حسن سنجری بھی شہزادہ کے ساتھ ملتان گئے۔ دونوں ملتان میں پانچ سال تک شہزادہ محمد کی موت تک رہے جو میدان جنگ میں منگولوں سے لڑتا ہوا شہید ہوا جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ خسرو اور حسن سنجری دونوں ہی شہزادہ کی قبل از

وقت موت سے بہت دلگیر و دلگرفتہ ہوئے۔ شہزادہ ان دونوں کے نزدیک جود وسخا کا مظہر تھا۔ منگولوں نے دونوں ہی کو قید کر لیا لیکن دونوں ہی کسی طرح سے دلی پہنچے اور شہزادہ کی موت کی دلگداز خبر سنائی۔ خسرو اپنے ایام اسیری کو یوں بیان کرتے ہیں:

"کیا تم جانتے ہو کہ کس طرح اس سال ملتان میں کافروں کی تاخت و تاراج میں مسلمانوں کا داہنا شہپر ٹوٹا؟ میں اس قہر خداوندی کو کیوں کر بیان کروں جس سے خود عزرائیل بھاگنا چاہتا تھا؟ یا میں کس طرح ان شجاعانہ حملوں کی تصویر کشی کروں جو وہ غازی یوں کر رہا تھا جیسے حیدر کرّار کا حملہ خیبریوں پر تھا؟ لیکن کوئی شخص اس تقدیر الٰہی کو کیوں کر بدل سکتا ہے جو خاص بارگاہ خداوندی سے صادر ہوتی ہے؟ . . . . . . شہیدوں کے خون سے زمین یوں تر ہو گئی جیسے پانی سے جب کہ قیدی یوں رسیوں میں بندھے ہوئے تھے جیسے پھول ہار میں، سر فتراکوں میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، ان کی گردنیں لگاموں کی گرہوں میں پھنسی ہوئی تھیں، حالانکہ میں اس بلائے ناگہانی سے زندہ بچ نکلا لیکن میں قیدی بنا لیا گیا اور موت کے خوف نے میرے نحیف و لاغر جسم میں ذرا سا بھی خون نہیں چھوڑا' میں سر کے بل سیلاب کے دھارے کی طرح بھاگا، اس دوڑ بھاگ کی وجہ سے میرے پیروں میں حباب کی مانند سینکڑوں چھالے نمودار ہو گئے اور میرے پیروں کی جلد پھٹ گئی، ان مصائب کی وجہ سے زندگی قبضۂ شمشیر کی طرح سخت نظر آنے لگی اور جسم ضعف کی بنا پر چوب تبر (؟) کی طرح خشک ہو گیا . . . .

بدن ایک خزاں دیدہ درخت کی طرح برہنہ تھا اور خاردار جھاڑیوں نے جو زخم لگائے تھے ان کی وجہ سے ہزاروں جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ آنسو کے قطرے میری آنکھوں سے یوں گرتے تھے جیسے دُلھنوں کی گردن سے موتی، وہ نفرت انگیز شخص جو مجھے اپنے آگے آگے ہنکا رہا تھا اس طرح اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی چیتا کسی پہاڑی پر، اس کے منھ سے بدبو آ رہی تھی اور اس کی گندی مونچھیں اس کی ٹھڈی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اگر تھکاوٹ کی وجہ سے میرے قدم سست پڑ جاتے تھے تو وہ کبھی اپنا تیغہ اور کبھی تمار کھینچ کر دھمکاتا تھا' میں ناامیدی میں سانسیں بھرتا تھا اور اپنے دل میں سوچتا تھا کہ میں کبھی بھی اس مصیبت سے نجات نہ پاؤں گا لیکن ہزار شکر ہے اس معبود حقیقی

> کا جس نے مجھے خلاصی دی اس حالت میں کہ میرے دل میں کوئی تیر پیوست نہیں ہوا اور میرے جسم پر تلوار کا کوئی زخم نہیں لگا۔[1]"

شہزادے کے ساتھ ملتان کے دوران قیام میں انھوں نے خوب اشعار کہے اور شہزادے کی شان میں ۲۳ قصیدے کہے جواب تک کسی کے لیے نہیں کہے تھے۔ اس دوران میں وہ ان بلندیوں تک پہنچے جن کی تمنا ہر شخص کرتا ہے لیکن بہت کم لوگ ان کو حاصل کر پاتے ہیں۔ اگرچہ ملتان میں خسرو کو ہر طرح کی آسائش حاصل تھی، اور عیش و نشاط کے سارے مواقع موجود تھے لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دلّی اور دلّی کے "بتان سادہ" کو فراموش نہ کر سکتے۔

شہزادہ محمد کی موت سے بلبن کو دلی صدمہ ہوا، اسّی سال کی عمر میں ایسا صدمہ مشکل ہی سے برداشت ہو پاتا ہے۔ اگرچہ بادشاہ پابندی سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا لیکن شہزادے کی موت کا غم اسے کھائے جا رہا تھا اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اب اس کے بھی دن قریب ہیں۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے لکھنوتی کے حاکم بغرا خاں کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن شہزادہ نے بوجوہ اس کو قبول نہیں کیا۔ بادشاہ نے اب متوفی شہزادہ محمد کے لڑکے کیخسرو کی طرف رجوع کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے اپنا ولی عہد بنانا چاہتا ہے لیکن کوتوال ملک الامرا نے اس تجویز کی مخالفت کی کیوں کہ کیخسرو بہرحال شہزادہ محمد کا لڑکا تھا اور ملک الامرا کے دل میں اس کی طرف سے کدورت تھی۔ بہرحال ملک الامرا نے اصرار کر کے بغرا خاں کے لڑکے معز الدین کیقباد کو بادشاہ کا ولی عہد نامزد کرا دیا۔

یہ اٹھارہ سالہ نوجوان شہزادہ بادشاہ کا جانشین ہوا اس کی پرورش و پرداخت بلبن کے مذہبی تقشف کے زیر اثر ہوئی تھی۔ وہ مادی عیش و نشاط کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ بے داغ کردار کا ایک معصوم نوجوان تھا لیکن اب اس پر نگاہ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ زندگی اپنی تمام برہنہ عشوہ سامانیوں اور ترغیبات کے ساتھ اس کے سامنے رقص کناں تھی۔ شراب و شہوت معمولات میں سے تھے، دوسرے اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر رہے تھے۔ وزیر اعظم ملک نظام الدین عملی طور پر بادشاہ تھا۔ کیقباد اب ہر طرح کی پستیوں کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ملکی مسائل کی طرف توجہ دیتا۔ دلّی کا دربار حسب توقع سازشوں کی

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال از امیر خسرو

آماجگاہ بن چکا تھا۔ ملک نظام الدین کے اکسانے پر شہزادہ کیخسرو کو جس کو بلبن نے ملتان بھیج دیا تھا قتل کردیا گیا۔ پورے ملک میں افراتفری، ابتری اور معاشرتی و اخلاقی گراوٹ کا دور دورہ تھا۔ یہ بڑھتی ہوئی بےاطمینانی ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ بن چکی تھی جس کو بلبن نے چالیس سال کی انتھک محنت و کوشش سے قائم کیا تھا۔ بیس سال وزیر اعظم کی حیثیت سے اور بیس سال بطور بادشاہ!

عیش طبع کیقباد کا باپ بغرا خاں ان حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دلّی کے اس تخت پر قابض ہونے کا وقت آگیا ہے جس کو اس نے اپنی حماقت سے کھو دیا تھا، اسے اپنے ہی بیٹے کو تخت سے ہٹانا تھا جو ان تمام اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کا ذمہ دار تھا جنھوں نے نظم و نسق کو بالکل کمزور کر دیا تھا اور ملک کو تباہی کے دہانہ پر لاکر کھڑا کر دیا تھا، شہزادہ نے دلی کی طرف اقدام کیا۔ بادشاہ کو بھی اس نئی صورت حال کے متعلق معلوم ہوا اور وہ بھی بہت ہی متکبرانہ شان سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ بادشاہ کی رفاقت میں اس کے امرا تھے جن میں خسرو کا سرپرست حاتم خاں خان جہاں بھی تھا جس سے خسرو شہزادہ محمد کی موت کے بعد وابستہ ہوگئے تھے۔ خسرو بھی اس خدم و حشم کا ایک حصہ تھے اور وہ ان تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ بڑی گہری نگاہوں سے کر رہے تھے، بہرحال باپ اور بیٹے کے درمیان مستقبل قریب میں ہونے والا خونیں تصادم کسی طور سے رک گیا اور شمس الدین دبیر کی طرح چند معقول اور نیک دل انسانوں نے درمیان میں پڑ کر باپ بیٹے میں مصالحت کرادی۔

یہ مسرت و شادمانی کا مبارک و مسعود موقع تھا۔ خسرو جیسا انسان اس موقع پر کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا۔ انھوں نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا، وہ یوں نغمہ سرا ہیں :

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد   زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہے ، پدر نیز سلطاں   کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
زبہر جہانداری و بادشاہی   جہاں را دو شاہ جہاناں یکے شد
یکے ناصر عہد ، محمود سلطاں   کہ فرمانش دو چار ارکاں یکے شد
دگر شہ ، معز جہاں ، کیقبادے   کہ در ضبطش ایران و توراں یکے شد

ترجمہ : کتنا خوش بخت ہے وہ ملک جہاں دو بادشاہوں میں مصالحت ہوجائے اور کتنا مبارک ہے وہ زمانہ جب دو وعدے ایک ہوجائیں۔

بیٹا بادشاہ ہے اور باپ بھی بادشاہ ہے۔ دیکھو اس ملک کی شان کو! دو بادشاہ متحد ہو گئے۔
دنیا پر حکومت اور فرماں روائی کرنے کے لیے دو طاقتور بادشاہ ایک ہو گئے ہیں۔
ایک زمانہ کا مددگار محمود سلطان ہے جس کا اقتدار و اختیار سلطنت کی چاروں جہتوں تک
پھیلا ہوا ہے۔
دوسرا بادشاہ دنیا کو عزت دینے والا کیقباد ہے جس کے زیر فرمان ایران اور توران
ایک ہو گئے ہیں۔

بعد میں کیقباد کی خواہش کے مطابق انھوں نے مثنوی قران السعدین تصنیف کی جس میں انھوں نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ خسرو کے بیان کے مطابق انھوں نے ۱۳۹۴۴ اشعار نظم کیے اور اودھ سے واپس آنے کے بعد چھ ماہ کے اندر مکمل ہوئی جہاں وہ اپنے سرپرست حاتم خاں کی معیت میں قیام پذیر تھے اس وقت ان کی عمر چھتیس ۳۶ سال کی تھی ؎

ساختہ گشت از روش خامہ   ازپس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام   یافت قران نامہ سعدین نام
اینچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت   بود سن شش صد وہشتاد وہشت
سال من امروز اگر بررسی   راست بگویم ہمہ شش بود وسی

اسی مثنوی میں ہمیں خسرو کی ایک غزل نظر آتی ہے جس میں انھوں نے دلی کے نگاران خوش اندام کو یوں یاد کیا ہے ؎

اے دہلی والے بتان سادہ   پگ بستہ وریشہ کج نہادہ
فرماں نبر ندازاں کہ ہستند   از غایت ناز خود مرادہ
جائے کہ بہ رہ کنند گلگشت   در کوچہ دور گل پیادہ
شاں در رہ و عاشقان بہ دنبال   خونناب ز دیدہا کشادہ
ایشاں ہمہ باد حسن در سر   وایں ہا ہمہ دل بباد دادہ
خورشید پرست شد مسلماں   زیں ہندوگان شوخ وسادہ

کردہ مرا خراب و سرمست   ایں مغ بچگان تاک زادہ
بربستہ شان بموئے مرغول
خسرو چو سگیست در قلادہ

کیقباد نے تین سال کی مختصر مدت تک حکومت کی اور یہ تین سال اس خاندان غلاماں کے لیے مہلک ثابت ہوئے جس کی بنیاد قطب الدین ایبک نے رکھی تھی اور شمس الدین التتمش نے استحکام بخشا تھا۔ کیقباد خود ملک نظام الدین کی سازشوں سے واقف ہو چکا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کسی صورت سے اس نے ملک نظام الدین سے نجات حاصل کر کے ملک جلال الدین خلجی کو عارض ممالک کا عہدہ سنبھالنے کے لیے دعوت دی، اس وقت تک کیقباد کی تندرستی بالکل جواب دے چکی تھی اور وہ صاحب فراش ہو چکا تھا۔ اس وقت دو گروہوں کے درمیان خونریزی ہوئی اور جلال الدین خلجی کا حامی گروہ کامیاب ہوا۔ جلال الدین خلجی دلّی کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس بیچ میں معذور اور کمزور کیقباد کو کسی نے قتل کر دیا اور اس طرح خاندان غلاماں کا خاتمہ ہو گیا۔ زمام حکومت اب خلجیوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔

★★★★★

۲

کیقباد کی موت ایسے حالات میں نہیں ہوئی جنھیں بہت زیادہ غیر معمولی کہا جا سکے۔ اس کے مرنے کے بعد جلال الدین خلجی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا جس کو ملک نظام الدین سے نجات حاصل کرنے کے بعد کیقباد نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے بلایا تھا۔ تخت نشینی کے وقت خود جلال الدین کی عمر ستّر سال کی تھی۔ اس سن رسیدہ بادشاہ نے اس عزم کے ساتھ زمام حکومت سنبھالی کہ وہ بدنظمیوں کا قلع قمع کرے گا۔ نرم دل، شجاع، شفیق اور فیاض ہونے کے علاوہ جلال الدین شعر و ادب کی بھی سرپرستی کرتا تھا اور کبھی کبھی خود بھی اشعار کہتا تھا۔ درج ذیل قطعہ اسی سے منسوب کیا جاتا ہے ؎

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم — واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی — ہاں، بانگ بلنداست ایں، پوشیدہ نمی خواہم[1]

خوش قسمتی سے دربار شاہی کی فضا خسروؔ کے لیے بہت سازگار تھی۔ وہ بادشاہ کے مقربین میں ہو گئے اور انھوں نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ بادشاہ ان پر اتنا مہربان ہوا کہ اس نے انھیں "مصحف دار" کے عہدہ پر فائز کر دیا اور امارت کی خلعت عطا کی۔ بارہ سو تنکہ سالانہ ان کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ ایک بار پھر خسرو کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایک کھلا ہوا ماحول ملا جہاں کہ ہر شخص ان کی تحسین و ستائش کرتا تھا۔ ان کے شعر و سخن کی استعداد نے پر و بال نکالنے شروع کیے۔ خسرو کی غزلوں کو درباری رقاصائیں اور موسیقار گاتے تھے اور ہر شخص ان سے حظ اٹھاتا تھا۔ اگر ایک طرف ساقیان عشوہ انگیز جام شراب پیش کرتے تھے اور خوبرو دوشیزائیں رقص کرتی تھیں اور نغمہ سرا ہوتی تھیں تو دوسری طرف خسرو کی

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ۔

غزلیں گائی جاتی تھیں اور اس محفل میں جسے بمشکل ہی اس عالم سے متعلق کہا جا سکتا تھا مردہ دلوں کو نئی زندگی ملتی تھی اور افسردہ خاطر مسرور ہوتے تھے[1] یہ ہیں خسرو کے ہم عصر، مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کے الفاظ۔ خسرو نے اب تک اپنی زندگی کی اڑتیس ۳۸ بہاریں دیکھی تھیں اور یہی درحقیقت ان کی خوش طالعی کا زمانہ تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے جلال الدین خلجی بہت ہی حلیم انسان تھا، بہر حال غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی اس کی عادت نے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ چند افراد کے بس میں نہیں تھا کہ کسی دھارے کا رخ موڑ دیں۔ بادشاہ کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں لیکن وہ عفو و درگذر سے کام لیتا تھا اور سازش کرنے والوں کو معاف کر دیا کرتا تھا جو بجائے اس کے کہ خود کو سدھارتے اس موقعہ سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس معاملہ میں حالات بہت خراب ہو چکے تھے یہاں تک کہ بادشاہ کے عزیز اور اقارب اس کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اس کی مدت حکومت صرف چھ سال رہی اور بالآخر وہ خود اپنے ہی بھتیجے اور داماد کی دغابازی کا شکار ہوا اور عجیب بات ہے کہ وہ اپنے اس بھتیجے اور داماد کو ہمیشہ اپنے لڑکے کی طرح مانتا رہا۔ علاؤ الدین خلجی نے جس کو بادشاہ نے اودھ اور کٹرہ کا حاکم بنا دیا تھا دو بدمعاشوں کے ذریعہ اس کو قتل کرا دیا۔ جلال الدین کے معتمد علیہ احمد چاپ کو اس سازش کی ہوا لگ گئی تھی اور اس نے بادشاہ کو متنبہ بھی کر دیا تھا لیکن بادشاہ علاؤ الدین کا اتنا گرویدہ تھا کہ اس نے اس مشورہ پر کوئی عمل نہیں کیا۔ جلال الدین مقتول ہوا اور علاؤ الدین عوام کی آتش غضب کو ٹھنڈا کرنے اور ان امراء پر قابو حاصل کرنے کے لیے، جو اس کے اس مکارانہ فعل سے اس سے بدظن ہو گئے تھے دلّی میں فاتحانہ انداز سے بغیر کسی مخالفت کے سیم و زر کی بارش کرتا ہوا داخل ہوا۔

اس موقعہ پر بھی ہم خسرو کو قاتل علاء الدین کی نہیں، بادشاہ علاء الدین کی مدح کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے سرپرست کے قتل پر کوئی بھی اظہار غم نہیں کیا اور غالباً وہ دلّی والوں کے نقش قدم پر چلے۔ ایک مثنوی میں علاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے اس مدح و ستائش کی بارش اولیں کا حوالہ دیتے ہیں جو انھوں نے بادشاہ پر کی تھی ؎

نہ من بودم از طبع دریا نشاں   جلوس ترا اولیں درفشاں

---

[1] محولہ ڈاکٹر وحید مرزا : امیر خسرو ۔ حیات اور کارنامے (انگریزی)

مبارک زبانی من بیں کہ بخت
بدرگاه دہلی ترا داده تخت

(ترجمہ : کیا میری دریا کی طرح فیاض طبیعت نے ترے جلوس پر سب سے پہلے موتی نہیں برسائے ؟

میری زبان کی خوش فالی دیکھ کر تقدیر نے تجھ کو دلّی کے دربار میں تخت بخشا)

بہرحال امیر خسرو کے دیوان میں ایسے بہت سے قصیدے ملتے ہیں جو جلال الدین خلجی کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ تو ظہیر الدین فارابی کے قصیدہ کی یاد دلاتا ہے جو سلطان قزل ارسلاں کی شان میں لکھا گیا تھا۔ خسرو کے قصیدے کے چند اشعار ذیل میں دیے جاتے ہیں ؎

سلطان جلال دیں کہ گہ تخت برشدن
چرخش ز ہفت کرسی خود نردباں دہد
فیروز شہ کہ صیت بلندش زماں زماں
از شرق تا بغرب ندائے اماں دہد
آں دم کہ گرد لشکر او بر رود بچرخ
پیشش بخاک بوسہ، مہ آسماں دہد

بادت مدام دولت و آنگاه دولتے
کز قدر کرّہ فلکت زیرِ راں دہد
بختے چنانکہ روئے ہمایونت را قضا
ہر دم نوید مملکت جاوداں دہد

(ترجمہ : سلطان جلال الدین وہ ہے کہ جب تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے تو آسمان اس کو اپنی ساتوں کرسیوں سے زینہ فراہم کرتا ہے۔

فیروز شاہ کی وہ ذات ہے کہ اس کی بلند آواز ہر لمحہ پورب سے لے کر پچھم تک امن و امان کا اعلان کرتی ہے۔

جس وقت اس کے لشکر کی گرد آسمان پر پہنچتی ہے تو آسمان کا چاند اس کے سامنے زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

خدا کرے تیری حکومت ہمیشہ قائم رہے اور تجھے ایسی حکومت حاصل ہو کہ کرۂ فلک بھی تیرے زیر فرمان آجائے۔

تجھے ایسی قسمت نصیب ہو کہ تقدیر تیرے مبارک چہرہ کو جاودانی حکومت

کا مژدہ سنائے ۔)

ایک دوسرے قصیدے میں وہ یوں زمزمہ سنج ہیں ؎

شہنشہا! فنِ خسرو چو موئے باریک است　　مگر ز مدحِ تو کو در چہ فن ہمی پیچد
بامتحانِ سخن، بہرِ پاسخ دگرے　　ردیف چستی ازیں ممتحن ہمی پیچد
بہ بیں کہ لقمہ چناں کردمش کہ لذّت آں　　نوالہ زپئے ہر دہن ہمی پیچد
بطرزِ من ہمہ پیچند آرے از پے خشم　　شبہ بر شتۂ در عدن ہمی پیچد
گہ دعات کہ طومار ہفت ہیکل چرخ　　بحضرتِ ملکِ ذو المنن ہمی پیچد
بساطِ قدر تو گسترده باد تا گویند
کہ بوریائے قیامت زمن ہمی پیچد

(ترجمہ : اے شہنشاہ ! خسرو کا فن بال کی طرح باریک ہے، تو دیکھ کہ تیری ستائش میں وہ کس طرح کی پیچیدگیوں میں الجھا رہتا ہے ۔

شعر و شاعری کے امتحان میں دوسرے کا جواب دینے کے لیے چستی کی ردیف اس ماہر سے الجھتی ہے ۔

تو دیکھ ! میں نے اس کو اس طرح کھایا کہ اس کی لذت کی وجہ سے جو نوالہ منھ کے باہر رہ جاتا ہے پیچ و تاب کھانے لگتا ہے ۔

لوگ میرے طرزِ شاعری سے پیچ و تاب کھا رہے ہیں گویا کوئلہ موتیوں کی لڑی پر غضب آلود ہو رہا ہے ۔

تیرے لیے دعا کرتے وقت آسمان حضور باری میں اپنی کتاب بند کر دیتا ہے ۔

تیری قدرت کی بساط اس وقت تک بچھی رہے کہ لوگ کہہ اٹھیں کہ زمانہ اب قیامت کی بوریا بچھا رہا ہے)

سلطان جلال الدین خلجی کے دغا بازانہ قتل کے بعد سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان کا غیر متنازع فیہ

حکمراں ہوگیا اور اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں کو اپنی سلطنت کی توسیع اور تاہنوز غیر مفتوح علاقوں کو زیر کرنے میں صرف کیے۔ نئی فتوحات حاصل کرنے کا یہ مالیخولیا اس کے ذہن پر اتنا حاوی ہوگیا کہ سکندر اعظم کی طرح اس نے بھی سارے خطۂ ارض کو اپنے زیر فرمان کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا' اس طرح کی خیالی باتوں اور عینیت پسندی کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ جب تک اس نے اپنی توجہات کو ان ارادوں کی تکمیل پر مرکوز رکھا اُس وقت تک اس کی سرحدوں کے اندر کے حالات متواتر خراب ہوتے رہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ بادشاہ کو اس افسوسناک صورت حال کے متعلق مناسب اور معقول مشورے دیتا، وہ کسی کی بات ہی نہیں سنتا تھا۔ ایک ہم عصر مؤرخ یوں رقم طراز ہوتا ہے :۔

> ” اپنی حکومت کے تیسرے سال میں علاء الدین سوائے عیش و عشرت میں پڑے رہنے، دعوتوں کا اہتمام کرنے اور جشن منانے کے کچھ نہیں کرتا تھا۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ہر طرف سے فتح کی اطلاعات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ ہر سال اس کے دو یا تین بچے پیدا ہوتے تھے۔ سلطنت کا کاروبار تشفی بخش طور پر ہو رہا تھا۔ خزانہ بھرا ہوا تھا، جواہرات اور موتیوں کے تھال اور صندوقچے روزانہ اس کے معائنہ کے لیے پیش ہوتے تھے' اس کے اصطبل میں بہت سے ہاتھی اور شہر اور مضافات میں ستر ہزار گھوڑے تھے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ اس فارغ البالی اور ثروت نے اس کو مخمور کر دیا تھا۔ ناممتناہی خواہشات اور عظیم مقاصد جو اس کی دسترس سے باہر تھے اس کے ذہن میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ جنم لیتے تھے اور وہ ایسے تصورات میں مبتلا ہوتا تھا جو اس سے قبل کسی اور بادشاہ کے ذہن میں نہیں آئے تھے۔ ان خام خیالیوں، بے خبریوں اور حماقتوں کی وجہ سے اس نے اپنا توازن کھو دیا تھا، وہ بالکل ناممکن منصوبے بناتا اور دیوانوں جیسی خواہشات کو دل میں جگہ دیتا، وہ بے پڑھا لکھا انسان تھا اور پڑھے لکھے لوگوں سے کوئی ربط نہ رکھتا تھا وہ ایک خط بھی نہ پڑھ سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا، وہ تندخو' ضدی اور سنگدل تھا اور دنیا اس پر مسکراتی تھی مگر خوش قسمت تھا اور اس کے منصوبے بالعموم کامیاب ہوتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور بھی ظالم اور سخت جان ہوگیا، وہ رسول مقبولؐ کی طرح بننا چاہتا تھا اور ایک نئے مذہب کا بانی بننے کا خواب دیکھ

رہا تھا۔ وہ دلّی میں اپنا ایک نائب متعین کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر (اپنی بزم مے نوشی میں یہ) کہا: "میں سکندر کی طرح نئی فتوحات کی تلاش میں نکلوں گا اور دنیا کو زیر نگیں کروں گا"، اس نے اپنے خطابات نماز جمعہ میں پڑھوانا شروع کیے اور سکّوں اور کتبات پر "سکندر ثانی" مضروب اور کندہ کروا دیا[ہ]"

یہ منصوبے اور یہ خیالات دوسروں کے نزدیک خواہ کتنے ناقابل عمل اور ناممکن رہے ہوں، لیکن علاء الدین انھیں سے اپنے شاہی کردار کا آغاز کرنا چاہتا تھا تاکہ آنے والے زمانہ میں اس کی شہرت فاتح عالم کی حیثیت سے ہو اس میں جو خطرات پوشیدہ تھے وہ بالکل واضح تھے، بہر حال اچھے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خیر کے ایک ہی وار میں برے سے برا آدمی بھی آن واحد میں اچھا بن گیا ہے اور اس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا ہے، بہر حال عقل نے اس کا ساتھ دیا اور آمر اور اپنی مرضی کا غلام علاؤ الدین ایک مرد دانا کے مشورہ پر بدل گیا جس نے اس سے یہ کہا کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنا وقت اور قوت دنیا کو فتح کرنے کے چکر میں ضائع کرے اپنے ملکی معاملات کو طے کرے "منگولوں کے اوپر ملتان کی راہ کو بند کرے" اور شراب نوشی اور عیش و عشرت ختم کرے، اس مرد دانا کے مشورہ نے بادشاہ کے دل پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور وہ رعایا کی معاشرتی، ثقافتی اور معاشی زندگی کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس نے بڑی سختی سے بہت سی شورشوں کو کچل دیا اور شر پسندوں کو سخت سزائیں دیں، شراب ممنوع قرار دے دی گئی اور اس طرح کی عیش و عشرت کی محفلوں اور جشنوں پر پابندی لگا دی گئی، ایک ہم عصر مؤرخ کا بیان ہے:

> " سلطان نے حکم دیا کہ جہاں کہیں کوئی گاؤں بطور انعام کسی کی ملک ہو یا اس کی حیثیت مذہبی وقف کی ہو اس کو بیک جنبش قلم سرکاری ملکیت میں لایا جائے لوگوں سے بجبر و اکراہ مختلف بہانوں سے روپے وصول کیے جاتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سوائے ملکوں، امرا، سرکاری افسران، ملتانیوں (ملتان کے بڑے تاجر) اور ساہوکاروں کے کسی کے پاس ایک حبّہ بھی نقد نہیں رہ گیا۔ یہ ضبطی اس قدر سخت تھی کہ چند ہزار تنکے سے اوپر ملک میں سارے وظائف ،

[ہ] ضیاء الدین برنی : تاریخ فیروز شاہی۔

آراضیات اور انعامات سرکار کے تحت آگئے، عوام اپنے وسائل حیات کی تلاش میں اس قدر محو تھے کہ بغاوت کا نام بھی زبان پر نہ آتا تھا[1]"

علاء الدین نے اس طرح ایک اخلاقی کردار متعین کیا، برائی کی اصل پر ضرب لگائی اور اپنے پورے حدود سلطنت میں ثبات، امن و امان اور نظم و نسق کی ضمانت دی۔ عصر حاضر کے تاریخ کے طالب علم کے نزدیک یہ اقدامات بڑے غیر انسانی ہوں گے اور وہ علاء الدین کو ایک ایسا جاہل ظالم بادشاہ کہہ کر گذر جائے گا جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک لکھے ہوئے آئین کی عدم موجودگی میں قانون تھا لیکن ہم جب اس زمانے کے حالات کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور جائزہ لیتے ہیں تو علاء الدین حق پر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے جاسوسی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ ذرا ذرا سی تفصیلات بھی اس کو معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ لوگ اشاروں میں باتیں کرتے تھے۔ ملک کی معاشیات کی اصلاح کے سلسلہ میں علاء الدین نے جو قدم اٹھایا وہ اس کا اپنا کارنامہ تھا، تجار، سوداگر اور عام دکاندار اتنے خوف زدہ رہتے تھے کہ وہ کم تولنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، ہر چیز، ہر جنس، یہاں تک کہ غلاموں، کنیزوں اور لونڈیوں کی بھی قیمت متعین تھی، غلط کاروں اور قانون سے ہٹ کر عمل کرنے والوں کے لیے بادشاہ کے دل میں کوئی ہمدردی کا جذبہ نہیں تھا اور انھیں سخت ترین سزا دینے میں اس کو ضمیر کی کوئی خلش نہیں محسوس ہوتی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہا ان اصلاحی اور تادیبی اقدامات پر تمام و کمال عمل ہوتا رہا۔

ان حالات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علاء الدین فنکاروں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی ہمت افزائی نہیں کرتا تھا، اس نے بیانہ کے قاضی کو اس لیے مدعو کیا تھا کہ وہ آکر حکومت کے نظم و نسق کے بارہ میں اسے مفید مشورے دیں۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے وہ خود اعتراف کرتا ہے:۔

> "اے دانشمند انسان! آپ بہت پڑھے لکھے ہیں لیکن آپ کو دنیا کا کوئی تجربہ نہیں، میں جاہل انسان ہوں لیکن میں نے بہت کچھ دیکھا ہے"

تاریخ میں اس کی سلطنت کے دس عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے آخری عجوبہ کو "عجائبات کا عجوبہ" کہا گیا ہے اور وہ عجوبہ تھا اس کے عدم التفات کے باوجود دانشوروں، صوفیا،

---

[1] ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی۔

شعرا، موسیقار اور مختلف فنون کے ماہرین کی کثیر تعداد[1] جب ہم اس طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا شاعر خسرو سب سے اونچے مقام پر دکھائی دیتا ہے، اس کے دوست امیر حسن سنجری اس کے بعد نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعرا اور دانشوروں میں صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجا، مولانا عارف عبد الحکیم اور شہاب الدین شامل ہیں۔ خسرو علاء الدین خلجی کی ملازمت میں داخل ہو چکے تھے اور انھیں ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ علاء الدین انھیں شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرتا تھا لیکن وہ ان بلند مراتب سے تقریباً محروم تھے جو انھوں نے ماضی میں حاصل کیے تھے۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ علاء الدین کا اکیس ۲۱ سالہ دورِ حکومت خسرو کی فنکارانہ صلاحیتوں کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوا، اسی زمانہ میں انھوں نے پنج گنج کی تکمیل کی جو انھوں نے مولانا نظامی گنجوی کے خمسہ کے طرز پر تصنیف کی تھی۔ ”خزائن الفتوح“ میں انھوں نے علاء الدین کی مہمات و فتوحات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخی دستاویز جو ان سرکاری اطلاعات پر مبنی ہے جو خسرو کو فراہم کی جاتی تھیں علاء الدین کی تمام وسیع فتوحات کا احاطہ نہیں کرتا لیکن معاصرانہ زندگی پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ”دول رانی، خضر خاں“ جو علاء الدین کے لڑکے خضر خاں کی داستان عشق پر مشتمل ہے اسی زمانہ میں مکمل ہوئی اور غالباً اسی وقت مکمل ہوئی جب انھوں نے اپنے تیسرے دیوان ”بقیۃ النقیہ“ کی تدوین پایۂ تکمیل کو پہنچائی، ”پنج گنج“ یعنی ”مطلع الانوار، شیریں خسرو، آئینۂ سکندری، لیلیٰ مجنوں“ اور ”ہشت بہشت“ میں اشعار کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہزار ۱۸۰۰۰ ہے اور ان کی تصنیف میں صرف دو سال کی مختصر مدت صرف ہوئی، ”پنج گنج“ کا یہ سلسلہ سلطان علاؤ الدین کے نام سے معنون ہے اور قاعدہ کے مطابق ان میں بادشاہ کی مدح بھی ہے۔ خسرو نے بادشاہ کی مدح و ستائش ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو پند و نصیحت بھی کی جو کوئی اختلاف و مخالفت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

جم ثانی، علاء دنیا و دیں   آسماں تاج و آفتاب نگیں
بادشاہ جہاں، محمد شاہ   سایبانِ جہاں ز چتر سیاہ
مہ سپہر منورش خوانده   دیں علاء مصورش خوانده

---

[1] ضیاء الدین برنی : تاریخ فیروز شاہی۔

شاہ دہیم بخش و تاج ستاں   ازعرب تا عجم خراج ستاں
عَلَمَش سر بر آسماں سودہ
سایہ بر آفتاب بکشودہ[1]

(ترجمہ : دوسرا جمشید، دنیا اور دین کا فخر جس کا تاج آسمان ہے اور جس کی مُہر سورج ہے۔

دنیا کا بادشاہ محمد شاہ اپنے سیاہ چتر کے نیچے دنیا کو پناہ دیتا ہے۔

چاند نے اس کو اپنا آسمان کہا جو منور ہے اور دین نے اسے اپنی مجسم شوکت کا لقب دیا۔

ایک ایسا بادشاہ جو تخت بخشتا ہے اور تاج چھین لیتا ہے عرب سے لے کر عجم تک خراج وصول کرتا ہے۔

اس کا عَلَم آسمان کی سرحدوں تک پہنچتا ہے اور اپنے نیچے سورج کو پناہ دیتا ہے….)

اس طرح وہ بادشاہ کی مدح و ستائش کرتے ہیں لیکن شاعر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ بادشاہ کو یوں مشورہ دیتے ہیں ؎

چوں خدایت سریر شاہی داد   ملکت از ماہ تا بماہی داد
کوش کاسودہ داری از شاہی   عالمے را زماہ تا ماہی
بر ستمکش ز عدل کم نہ کنی   بر ستمگار جز ستم نہ کنی
خار بُن را برافگنی ز گذر   خار کن را کنی نہال زسر
چوں بہ پیلاں علف دہی حالی   از غمِ مور دل مکن خالی
عالم آسودہ کن زنعمت وجود   تا تو خوش باشی و خدا خوشنود
چوں بخاصاں دہی نوالہ و جام   کام شاں خوش کنی بنعمت وکام
یاد کن زاں گدائے بے توشہ
کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ[2]

---

[1] امیر خسرو : مثنوی ہشت بہشت۔

[2] ایضاً   ایضاً۔

ترجمہ : خدا نے جب تجھ کو بادشاہی کا تخت عطا کیا ہے اور ایک ایسی سلطنت دی ہے جو آسمان سے لے کر زمین کی تہہ تک پھیلی ہوئی ہے ۔

تو اس بات کی کوشش کر کہ اپنی بادشاہت سے آسمان سے لے کر زمین کی تہہ تک ایک عالم کو آسودہ رکھے ۔

تو مظلوم کے ساتھ انصاف کر اور ظالم کو سزا دے ۔

کانٹے کو راہ سے ہٹا دے اور کانٹا کھود کر پھینکنے والے کو شاد و خرم کر دے ۔

اگر تو ایک طرف ہاتھیوں کو چارہ مہیا کرے تو دوسری طرف چیونٹی کی جانب سے بے توجہ نہ ہو ۔

تو اپنی فیض بخشی اور سخاوت سے دنیا کو سیر رکھ تاکہ تو بھی خوش رہے اور خدا بھی ۔

جس وقت تو اپنے خاص احباب کو نوازے اور ان پر اپنے مہر و کرم کی بارش کرے ۔

تو اس فاقہ کش فقیر کو بھی یاد رکھ جو رات کے وقت کسی کونے میں پڑا رہتا ہے)

علاء الدین جیسے مطلق العنان بادشاہ کو اس طرح کے بے باکانہ اور صاف صاف مشورے خسرو کی اس اخلاقی جرأت کے ترجمان ہیں جس کے زیر اثر وہ دو ٹوک، سچی اور صحیح بات کہہ سکتے تھے یہی نہیں بلکہ بادشاہت کے متعلق ان کے نظریہ کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے ۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، علاء الدین کے پیش رو جلال الدین خلجی نے خسرو کو "مصحف دار" کا منصب عطا کیا تھا" علاء الدین نے انھیں اس سے محروم کر دیا ۔ نتیجہ کے طور پر ان کی زندگی کے شب و روز بڑی تنگدستی اور عسرت سے بسر ہونے لگے ، ایک قصیدہ میں بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے وہ یوں اپنے معروضات پیش کرتے ہیں ؎

اے شہنشاہی کہ گردوں ربوبیت کرد و گفت　　بندۂ مستظہرم من از عطائے عام شاہ
خواہشم از خدمت شاہاں شغل مصحف دار لیست　　تا بود حرز دعایم جوشن اندام شاہ
ہست مقصود آنکہ باری دولتے حاصل کنم　　خاصہ چوں دریافت بختم نوبت و ایام شاہ
آنکہ شغل شہ دہد از سیم و زر تا عمر ہست　　خوش بود چوں عمر شد چہ سودم از انعام شاہ
وآنچہ خسروی دہد از شعر عمر جاوداں
زاں بخواہد ماند باقی تا قیامت نام شاہ[1]

---

[1] بقیہ نقیہ : امیر خسرو۔

(ترجمہ : اے وہ بادشاہ کہ تیری طرف آسمان نے اپنا چہرہ کیا اور کہا کہ میں بادشاہ کی عام سخاوت کا امیدوار غلام ہوں۔

بادشاہوں کی طرف سے میرے سپرد مصحف داری کی خدمت ہے تاکہ میری دعا کا تعویذ ادشاہ کے جسم کی حفاظت کرے۔

یری آرزو یہ ہے کہ مجھے یہ دولت پھر حاصل ہو خاص طور پر اس دور میں جب میری تقدیر کو اس بادشاہ کا زمانہ ملا۔

بادشاہ اگر زندگی میں مجھے سیم و زر دے تو بہتر ہے ورنہ جب زندگی ختم ہو جائے گی تو بادشاہ کے انعام سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔

خسرو اپنے شعر کے ذریعہ جو عمر جاوداں دے رہا ہے اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ کا نام قیامت تک باقی رہے۔)

خسرو نے اپنی ضخیم نثری تصنیف "اعجاز خسروی" اسی زمانہ میں مکمل کی۔ اس نثری تصنیف سے مختلف نثری اسلوب و طرز انشا پر ان کی حیرتناک قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، لوگوں کی عام حالت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :۔

> "ایک طرف تو اس کی زبردست طاقت نے چنگیز، خانیوں کی کوہ پیکر افواج کو جیحون کے اس پار ڈھکیل دیا اور دوسری طرف ہندوستان کے وہ طاقت ور امرا جو ترکوں کی افواج کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روندتے تھے ہاتھی اور خزانہ دینے کے لیے مجبور ہوئے لیکن ان میں سے چند کو جو اب بھی زیر نہیں ہوئے تھے اس طرح کچل دیا گیا کہ ان کے سروں کو تیل کی بالٹیوں کی طرح ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے پھینک دیا گیا اور پھر ان بالٹیوں کے تیل سے ان ہاتھیوں کے پیروں کی خشونت نرم پڑ گئی۔
> عدل اور رعایا کی خوشحالی کے معاملہ میں اس نے ایسے قوانین بنائے ہیں جن کا عکس تو آئینۂ سکندر میں آ سکتا ہے نہ ہی انھیں جام جم میں دیکھا جا سکتا ہے، اپنے متوازن نظام عدل کے تحت اس نے غلّہ کی ارزانی کا جو سرمایۂ زندگی کا خمیر ہے ایسا اصول بنایا ہے کہ اگر یہ آوارہ بادل اپنی پیشانی کے پسینے کو برسوں نہ برسائیں، ہوائیں اپنی مروحہ

> جنبانی نہ کریں، زمین سرخ سبزہ نہ اُگائے اور گرم سورج فصلوں کو نہ پکائے تو بھی وہ اپنی عام رعایا کو اپنے غلّے کے ذخیروں سے کھانا بہم پہنچا سکتا ہے' لوگوں کی ضرورت کی دوسری اشیا کو بھی خواہ وہ کبریت احمر یا لعل سفید ہی کیوں نہ ہو اس نے ارزاں تر کر دیا ہے اور زرد عنبر اور سرخ اناج کے مقابلہ میں زیادہ قابل حصول بنا دیا ہے' مزید براں دولت جو خواہشات کا آبِ حیواں ہے اور محبوب ترین شئے ہے اس کے گراں قدر انعامات اور بیش قرار عطیات کی وجہ سے اتنی سستی ہو گئی ہے کہ کوئی شخص بھی کسی چیز کی قیمت کی زیادتی کا بوجھ نہیں محسوس کرتا، بطور نتیجہ اس کے پورے حدود سلطنت میں فارغ البالی اور خوشحالی کا دور دورہ ہے .... ڈاکو دولت کے سائے سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے سورج سے سایہ اور انصاف اس طرح سے ظلم کے استیصال میں مصروف ہے جیسے چراغ تیرگی کے، طاقتور ہاتھی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ نحیف و ناتواں چیونٹی کی راہ میں اکڑ کر پاؤں رکھے اور بھو کے شہر میں یہ جرأت نہیں ہے کہ لنگڑے ہرن کی چال پر ہنسے[1] "

سلطان علاءالدین خلجی کے فارغ البال دور حکومت اور پرامن زندگی کے بارہ میں خسروؔ کی بیان کردہ تفصیلات کچھ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ضیاءالدین برنی کے بیان کی بنیاد پر انھیں اس الزام سے بری کیا جا سکتا ہے جو مذکور ہو چکا ہے۔ برنی نے بھی یہی داستان دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔

سلطان علاءالدین خلجی کا انتقال استسقا کے مرض میں ۱۳۱۶ء میں ہوا، اس نے بیس سال تک کامیابی کے ساتھ اور بغیر کسی مخالفت کے حکومت کی ، ایسی سخت اور جابرانہ حکومت کے ناخوشگوار نتائج کا ظہور میں آنا لازمی تھا۔ ملک کافور نے جو ایک پست خاندان کا نومسلم تھا بادشاہ کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا، اسی کے اکسانے پر بادشاہ نے اپنے لڑکے خضر خاں کو قید کر دیا تھا، مزید براں اپنے شجاعانہ کارناموں اور متعدد فتوحات کی بنا پر وہ بادشاہ کے اور بھی قریب ہو گیا تھا، بادشاہ جب بستر علالت تھا تو اس نے ایک فرمان جاری کرا دیا جس کی رو سے خضر خاں کو تخت و تاج سے محروم

---

[1] اعجاز خسروی' دیباچہ: محولہ ڈاکٹر وحید مرزا : امیر خسرو - حیات اور کارنامے (انگریزی)

قرار دے دیا گیا اور اس کی بجائے اس کے ایک نابالغ لڑکے کو اس کا ولی عہد نامزد کیا گیا۔ بادشاہ کے انتقال کے معاً بعد ملک کافور نے یہ شاہی فرمان امرا کو دکھلایا اور پھر نابالغ شہزادہ شہاب الدین کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ دغابازی اور نافرمانی کا سب سے پہلا کام جو اس شغال صفت نے اپنے آقا کے خاندان کے ساتھ کیا وہ خضر خاں کا اندھا کرنا تھا اور اس کے بعد خانوادۂ شاہی کے جن جن شہزادوں کا حق تخت شاہی پر ہوتا تھا ان سب کو اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوہ ملکۂ جہاں کو اس کی ساری ملکیت، دولت، قیمتی ساز و سامان اور زر و جواہر سے محروم کر دیا گیا، شاہی خاندان کا تنہا فرد جو فرار ہو کر بچ رہا وہ مبارک شاہ خلجی تھا۔ ایک معاصر مؤرخ کے یہ الفاظ ہیں:۔

> "اگرچہ علاء الدین نے چند سالوں تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور ہر چیز میں اس کی خواہش کے مطابق ترقی ہوتی گئی اور اگرچہ اس کی بیویاں تھیں، بچے تھے، خاندان اور متوسلین تھے، دولت و شوکت تھی، پھر بھی وہ اپنے آقا اور سرپرست کے خون کے انتقام سے بچ نہ سکا، اُس نے فرعون کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کا زیادہ خون بہایا جو بے گناہ تھے، بالآخر تقدیر نے اس کی راہ میں ایک ایسے دغاباز کو لا کھڑا کیا جس نے اس کے خاندان کو تباہ کر دیا اور جو انتقام اس سے لیا گیا وہ کسی بھی کافرانہ سرزمین پر نہیں پایا گیا[1]"

خوف و دہشت اور قتل و غارت گری کا یہ رقص عریاں بہر حال چند ماہ تک جاری رہا اور دغاباز ملک کافور کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور بالآخر اپنی خوابگاہ میں مقتول ہوا۔ علاء الدین کا صرف ایک بیٹا مبارک شاہ خلجی زندہ تھا، اس کو تخت نشین کیا گیا، اس خوبرو نوجوان سے بہرصورت جائز طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے گا اور ملک میں امن و امان قائم رکھے گا لیکن اس سے جو توقع تھی اس کو اس نے پورا نہ کیا، دربار شاہی شراب خانہ میں تبدیل ہو گیا، شراب نوشی اور عیش و عشرت نے جو اس کے باپ کے دور میں بالکل ممنوع تھیں، بادشاہ اور امرا کو اس احساس غیرت و توازن سے محروم کر دیا تھا جو علاء الدین کے دورِ حکومت

---

[1] ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی۔

کا طرۂ امتیاز تھا۔ اپنے باپ کی طرح بادشاہ کا بھی ایک محبوب خسرو خاں تھا جو صحیح معنوں میں بغیر کسی کی شرکت کے ملک کا حکمراں تھا، نہ تو رمضان کے روزے رکھے جاتے تھے اور نہ نمازیں ادا کی جاتی تھیں، بادشاہ شہوت پرستی اور سفلگی کا سراپا ہو چکا تھا، اگر کبھی وہ ملک پر حکمرانی کرتا تو وہ خسرو خاں کے ذریعہ کرتا۔ اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے کیقباد کی محفل عیش و طرب دیکھی تھی، مبارک شاہ اس سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ آخر کار آخری ضرب پڑی اور چار سال حکومت کرنے کے بعد ۱۳۲۱ء میں آقا بھی اپنے محبوب کے ہاتھوں مقتول ہوا اور اس سانحہ کے ساتھ خلجی خاندان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

خسرو خاں کے اس دغابازانہ فعل کا مقصد دلی کے تخت کو غصب کرنا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ جب خسرو خاں نے بادشاہ کے خلاف شورش کا آغاز کیا تو بادشاہ خطرہ کا احساس کر کے حرم کی طرف بھاگا لیکن خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں نے اس کو مغلوب کر کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا، تخت پر قبضہ کرنے کے بعد خسرو خاں نے بے گناہوں کو قتل کرنے کا نفرت انگیز کام شروع کیا، امرا کو بے عزت کیا گیا، قرآن کی بے ادبی کی گئی اور مسجدوں میں بت رکھے گئے، حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ ملک تغلق، جس کے سر منگولوں کے حملوں کو روکنے کا سہرا ہے، خسرو خاں کی دغابازی کا انتقام لینے کے لیے چل پڑا، بالآخر خسرو خاں کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔

پستی و رزالت، اخلاقی گراوٹ اور سیاسی ابتری کے اس نامسعود دور میں جو علاءالدین کی موت کے معاً بعد (جو ملک کافور کی وجہ سے اور بھی جلد آگیا) ظہور میں آیا، امیر خسرو ایک مختصر مدت کے سوا عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنے فنکارانہ مشاغل کی دنیا میں زاویہ نشین رہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ حالات سے بے خبر رہے، وہ درباری سازشوں، بے دردانہ قتل اور طرح طرح کی نفرت انگیز بے حیائیوں کے خاموش مگر عینی شاہد تھے، باوجود اس کے کہ قطب الدین مبارک شاہ غلط راہوں پر لگ گیا تھا اور اس کے تعلقات حضرت نظام الدین اولیا سے اچھے نہ تھے لیکن خسرو نے بادشاہ سے اپنے تعلقات کو برقرار رکھا اور بادشاہ بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔

جب بادشاہ نے اپنے دور حکومت کی تاریخ لکھنے کے لیے کہا تو انھوں نے اپنی مثنوی ”نہ سپہر“ لکھی، بادشاہ نے بھی انھیں ہاتھی کے ہم وزن سونا دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے یقیناً اپنے وعدہ کا پاس کیا ہو گا جیسا کہ خود خسرو اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو بادشاہ نے ایسا انعام دیا جو اس سے پہلے کسی بھی بادشاہ نے نہیں دیا تھا۔ خسرو بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے یوں اس کو خطاب

کرتے ہیں ؎

شد اکنوں کہ اقبال ہمدم مرا   نوا زندہ شد قطب عالم مرا
شہا گنج بخشا، کرم گسترا   معانی شناسا، سخن داورا
چنیں بخششے کز تو جم یافتم   ز شاہان پیشینہ کم یافتم
کنوں لابد از سحر سنجے چو من
با ندازۂ بخشش آید سخن[1]

(ترجمہ : اس وقت جب میری قسمت یاور ہوئی تو دنیا کا قطب مجھے نوازنے والا گیا۔

اے بادشاہ، اے خزانہ دینے والے، اے کرم کرنے والے، علم و ہنر کی قدر و قیمت جاننے والے اور شعر و سخن کے سرپرست!

تجھ جیسے جمشید سے مجھے جو انعام ملا وہ گزشتہ زمانہ میں مجھے شاذ ہی ملا ہوگا

اب مجھ جیسے جادو نگار سے ضروری طور پر جود و کرم کے مطابق مدح و ستائش ہوگی)

★★★★★

---

[1] امیر خسرو : نہ سپہر۔

۳

امن و امان قائم کرنے کے بعد اور یہ دیکھ کر کہ اس کے آقا کے خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں ہے، غیاث الدین تغلق بغیر کسی مخالفت و مزاحمت کے دلّی کے تختِ شاہی پر متمکن ہوا، خسرو اس وقت ستّر سال کے پختہ سال انسان تھے انھوں نے نئے بادشاہ کا خیر مقدم ان الفاظ کے ساتھ کیا:

شہ غیاث الدین و دنیا ثانی بومسلم است　　کو برخم تیغ کیں ثانی حیدر درکشید
حامی اسلام، تغلق شاہ، کانجم سالہا　　چرخ می زد تا فلک زیں گونہ دیں پرور کشید

(ترجمہ: بادشاہ غیاث الدین جو دنیا کا بھی غیاث ہے ابو مسلم کا ثانی ہے جس نے اپنی تلوار کے وار سے ثانی حیدر کا بدلہ لے لیا۔

اسلام کا مددگار تغلق شاہ وہ ہے کہ ایسے دیں پرور کو پیدا کرنے میں آسمان سالہا سال سیاروں کو گردش دیتا رہا۔)

غیاث الدین تغلق بقول امیر خسرو یکم شعبان ۷۲۰ھ کو تخت نشین ہوا[1] وہ ایک پاکباز اور نرم دل انسان تھا اور امیر خسرو کا بڑا احترام کرتا تھا اس کے تخت نشین ہونے کے معاً بعد دیوگیر میں شورش پیدا ہوئی اور وہاں کے راجہ لدّر دیو نے تخت دہلی کے خلاف بغاوت کر دی، چنانچہ بادشاہ نے اپنے بیٹے جونا خاں المعروف بہ الغ خاں کو بغیر کسی تاخیر کے ۷۲۱ھ میں لدّر دیو کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، گمان غالب یہ ہے کہ امیر خسرو الغ خاں کے ہمراہ دیوگیر گئے اور انھوں نے ایک قصیدہ "صحیفۃ الاوصاف" الغ خاں کی فتوحات پر مشتمل لکھا۔ اس قصیدہ میں دیوگیر (جو اس وقت تک قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے نام پر "قطب آباد"

---

[1] امیر خسرو: تغلق نامہ۔

کی حیثیت سے معروف تھا) کی عمارتوں کا ذکر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دیوگیر کے حسن سے بہت متاثر ہوئے، چنانچہ اس حسین و جمیل شہر کے متعلق انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ایک قصیدہ میں کیا ہے جو الغ خاں کی مدح میں ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

> ” حیرتناک اور مبارک شہر، بابرکت سلطنت کی دولھن جس کو قطب عالم کی بارگاہ سے قطب آباد کا نام حاصل ہوا، جب یہاں کفر بڑھا تو عفریتوں نے لوگوں کو پریشان کیا، اسی لیے قدیم دیو نے اس کا نام ” دیوگیر“ رکھا۔ اب چوں کہ اس کی حیثیت ” تخم “ اسلام کی ہو گئی ہے اس لیے اب اس میں کوئی دوسری چیز سوائے خوش بخت مبارک و تبرک سمندر کے نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کو اگر جنت کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا لیکن اس کو یہ نہ کہوں گا مبادا اس سے جنت شداد سمجھ لیا جائے، یقیناً اس شہر کی قسمت میں تھا کہ خلافت اسلامیہ کے تحت یہ جنت ہو، یہی سبب ہے کہ اس کی آرائش اتنی احتیاط سے کی گئی ہے . . . . . .“

بہرحال، الغ خاں اس مہم میں کامیاب نہیں ہوا اور اُسے ناکامی ہی کی حالت میں اس لیے دلی واپس آنا پڑا کہ سپاہیوں میں یہ افواہ اڑ گئی کہ سلطان غیاث الدین تغلق کا انتقال ہو گیا، وہ بعجلت تمام دلی لوٹا، چند ماہ آرام کرنے کے بعد وہ پھر اس مہم پر روانہ ہوا اور اس مرتبہ اس نے اس بغاوت کو کامیابی کے ساتھ دبا دیا۔

اپنے لکھنوتی جانے سے قبل سلطان غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد کا قلعہ تعمیر کروالیا تھا، اس قلعہ کی تعریف ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں کی ہے۔ خسرو کے دیوان ”نہایت الکمال میں بھی ایک مثنوی ” در تعریف تغلق آباد “ ملتی ہے، اس سے تغلق آباد کے قلعہ کے متعلق بہت سی ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جو ابن بطوطہ نے لکھی ہیں۔ خسرو قلعہ کے ایک حوض کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں ؎

درون قلعه آئینے بائیں بجوانده بازعین الحفر یا ایں
بصفوت پایه لطف آب ورنگش بشیرینی همه لیسیده سنگش
دہانش عمر بخش و زندگی زائے
زلالش سلسبیل راحت افزائے[1]

---

[1] امیر خسرو : دیوان نہایت الکمال مثنوی در تعریف ”تغلق آباد۔

(ترجمہ: قلعہ کے اندر ایک ایسا خوبصورت مقام ہے کہ اس کو چشمۂ حیوان کہنا چاہیے ، اس کے پانی کی لطافت اور رنگ خالص ترین ہے، اس کے پتھر مٹھاس کو چاٹے ہوئے ہیں، اس کا کنارہ عمر بخشتا ہے اور زندگی پیدا کرتا ہے اور اس کا پانی خوشی کو بڑھانے والی نہر ہے)

بادشاہ نے قلعہ کے باہر عوام کی آسائش کے لیے بھی ایک حوض بنوایا تھا، اس کے بارے میں خسرو یوں زمزمہ سنج ہیں ؎

برون قلعہ حوضے ہم چو دریا　　بہر کنجش دریائے مہیا
زبس کاسائش جاں گشتہ آبش　　شدہ ہمشیرۂ کوثر خطابش
ز زیبائیٔ بریں حوض جہانگیر　　فرود آوردہ ابر از آسماں شیر
میان قلعہ قصرِ آسماں قدر　　کہ نور او مہ نور افگند بدر

ہمہ دیوار و سقفش از زرناب
مرصع از گہر ہائے جہانتاب[1]

(ترجمہ: قلعہ کے باہر سمندر کی مانند ایک حوض ہے، اس کے ہر گوشے میں ایک دریا بہہ رہا ہے۔
جان کے لیے اس کا پانی بہت زیادہ راحت کا سبب ہے کہ اس کا خطاب "کوثر کی بہن" ہوگیا۔
زیبائی کی وجہ سے اس وسیع و عریض حوض پر بادل آسمان سے دودھ برساتا ہے۔
قلعہ کے بیچ میں آسمان جیسا اونچا ایک محل ہے کہ اس کی روشنی چودھویں کے چاند کی روشنی کو ماند کر دیتی ہے۔
اس کی دیواریں اور چھتیں خالص سونے کی بنی ہوئی ہیں اور انھیں دنیا کو روشن کرنے والے موتیوں سے سجایا گیا ہے)

---

[1] امیر خسرو : دیوان نہایت الکمال مثنوی در تعریف تغلق آباد۔

اگرچہ سلطان غیاث الدین تغلق کے تعلقات امیر خسرو سے بہت اچھے تھے لیکن وہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کی سرگرمیوں سے مطمئن نہ تھا اور ان کی طرف سے اس کے دل میں غبار تھا۔ تاریخوں میں اس کے کئی سبب بیان کیے جاتے ہیں ـــــ ایک سبب تو یہ تھا کہ خسرو خاں نے تخت سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد صلحا، علما، امرا و عوام کو خوش کرنے کے لیے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بڑی داد و دہش کی اور خزانے لٹائے۔ اس داد و دہش میں سے بقول فرشتہ پانچ لاکھ تنکہ کی رقم حضرت سلطان المشائخؒ کے حصہ میں بھی آئی جو آپ نے فقرا و مساکین میں اس بنیاد پر تقسیم کرادی کہ یہ بیت المال کی رقم تھی اور یہ فقرا و مساکین کا حق تھا اب جب غیاث الدین تغلق سریر آرائے مملکت ہوا تو اس نے خزانہ خالی پایا اُسے بڑی تشویش ہوئی چنانچہ اس نے اس تمام رقم کی بازآوری کا فیصلہ کیا۔ حضرت سلطان المشائخؒ سے بھی مطالبہ کیا گیا آپ نے جواب میں مذکورہ عذر پیش کردیا۔ بادشاہ کو مایوسی ہوئی مگر آپ کی طرف سے کبیدہ ہوگیا۔[1]

حضرت سلطان المشائخؒ سے کبیدگی کا دوسرا سبب حلت سماع کا تھا جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، بادشاہ خود احکام شرعی کا سختی سے پابند تھا اور نفاذ شریعت کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ بادشاہ جن لوگوں کے ہجوم میں گھرا رہتا تھا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت سلطان المشائخؒ سے آپ کی مقبولیت و شہرت کی وجہ سے پرخاش رکھتے تھے۔ انھوں نے قوالی کی ان محفلوں کے خلاف جو حضرت سلطان المشائخؒ کے خلوت خانہ میں ہوتی تھیں بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اور حضرت شیخ المشائخؒ کو دربار شاہی میں سماع کے متعلق اپنا موقف واضح کرنے کے لیے طلب کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر بادشاہ کے اشارہ پر قاضی جلال الدین نائب حاکم نے حضرت سلطان المشائخؒ کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال کیے۔[2]

ابن بطوطہ بحوالہ شیخ کمال الدین بن برہان غزنوی قاضی القضاۃ دہلی ایک اور سبب بتاتا ہے ـــ شہزادہ جوناخاں المعروف بہ الغ خاں حضرت سلطان المشائخؒ کے معتقدین میں تھا اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے خانقاہ کے حاضرین و خدام سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت سلطان المشائخؒ جب جذبے کے عالم میں ہوں تو اسے فوراً مطلع کیا جائے

---

[1] امیر خورد : سیرالاولیا۔

[2] امیر خورد : سیرالاولیا۔

چنانچہ جب وہ وقت آیا تو شہزادہ کو مطلع کیا گیا، شہزادہ فوراً حاضر ہوا۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا "ہم نے تجھ کو سلطنت بخشی (یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب جونا خاں نائب ملک کی خدمت انجام دے رہا تھا اور سلطان غیاث الدین لکھنوتی گیا ہوا تھا اور ابھی دلی نہیں لوٹا تھا) اس عرصہ میں شیخ کا انتقال ہو گیا تو جونا نے ان کے جنازے کو کندھا دیا، یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوا۔[1]

انھیں تمام اسباب کی بنا پر اس روایت کو تقویت ملی کہ جب سلطان لکھنوتی سے واپس آرہا تھا تو اس نے حضرت سلطان المشائخؒ کے پاس کہلوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے دلّی پہنچنے سے قبل دلی چھوڑ دیں، یا تو دلّی میں وہ رہیں گے یا میں رہوں گا۔ اس فرمان کے پہنچنے پر آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا تھا جو آج تک ضرب المثل کی حیثیت سے زبان زدِ خاص و عام ہے یعنی "ہنوز دلّی دور است[2]" چنانچہ منقول ہے کہ دلّی پہنچنے سے قبل جو دروازہ کو شک سلطان کے خیر مقدم کے لیے تعمیر کیا گیا تھا وہ سلطان پر گر پڑا اور اس طرح اس کی موت واقع ہو گئی، یہ واقعہ ۱۳۲۵ء کا ہے۔

اسی سال حضرت سلطان المشائخؒ کی بھی وفات ہو گئی، خسرو دلّی میں موجود نہ تھے بلکہ سلطان غیاث الدین تغلق کے ساتھ لکھنوتی سے واپس ہو رہے تھے۔ انھیں اس سانحہ کی اطلاع اثنائے راہ میں ملی ہو گی جب وہ دلّی پہنچے تو حضرت سلطان المشائخؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور ہندی کا یہ دوہا پڑھا؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چو ندیس

یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے اپنے سر کے بال کٹوا دیے تھے اور منہ سیاہ کر کے مزار پر حاضر ہوئے اور خانقاہ کے دروازہ پر پہنچ کر اوّل یہ شعر پڑھا؎

ایں مکانیست کہ منزلگہ جاناں بودہ است   راہ آمد شد ایں سرو خراماں بودہ است

مزار پر پہنچ کر کہا "سبحان اللہ! آفتاب زیرِ زمیں نہاں ہو اور خسرو زندہ رہے" اور پھر مذکورہ بالا ہندی دوہا پڑھ کر بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے "اے

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ، ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۵۶ بحوالہ ممتاز حسین : امیر خسرو دہلوی۔

[2] عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ۔

مسلمانان من کدام کس باشم کہ برائے چنیں بادشاہے بگریم فامابرائے خود بگریم کہ بعد از سلطان المشائخ "مرا چنداں بقائے نخواہد بود" پھر اپنا سارا مال و اسباب اپنے پیر و مرشد کے نام پر خیرات کر دیا، اس کے چھ ماہ بعد ۱۸؍ شوال ۷۲۵ھ (مطابق ۱۳۲۴-۲۵ء) بروز چہار شنبہ اپنے جاں آفریں سے جا ملے اور جیسا کہ انھوں نے تمنّا کی تھی اپنے پیر کے پائین مدفون ہوئے ع

زہے بخت ار تہہ پالش بمیرم[1]

اس طرح ایک ایسے شخص کی پرشور زندگی اپنی آخری منزل سے ہمکنار ہوئی ہے جس کی آنکھوں نے متعدد انقلابات دیکھے، بڑے نشیب و فراز سے ہو کر گزرا، خاندان غلاماں کے وقت سے لے کر خاندان خلجی تک کتنے ہی شاہی خانوادوں کے عروج و زوال کو دیکھا، منگولوں کے دست جور و ستم میں پڑا، شاہوں اور شہزادوں کی مدح سرائی کی، اپنی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں کے نقطۂ عروج تک پہنچا اور پھر اخیر میں سب سے بڑھ کر روحانی ولی نعمت اور آقا حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کا سچا اور فرماں بردار غلام ہو گیا، الغرض امیر خسرو جیسے انسان شاذ پیدا ہوتے ہیں اور جب پیدا ہوتے ہیں تو حیات جاوید لے کر آتے ہیں اور مستقبل پر اپنے نہ مٹنے والے پُرعظمت نقوش ثبت کرتے ہیں۔ امیر خسرو ہر زمانے کے لیے ہیں اور وہ اپنی موت کے بعد بھی دور و نزدیک کے ہر انسان سے تشکر آمیز خراج وصول کرتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

بقول ڈاکٹر وحید مرزا "بابر کے زمانے سے خسرو کے مزار پر کوئی پختہ عمارت نہیں بنی...... باہر کی چار دیواری اور لوح، بابر ہی کے عہد میں ایک امیر مہدی خواجہ کی زیر نگرانی تیار ہوئی تھی اور لوح پر جو کتبہ ہے اسی عہد کے ایک شاعر شہاب معمائی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے[2]"، لوح مزار پر یہ کتبہ

---

[1] سفینۃ الاولیا، مونس الارواح، تذکرۃ الواصلین، جواہر فریدی بحوالہ حیات خسرو از منشی محمد سعید مارہروی۔

[2] ڈاکٹر وحید مرزا: امیر خسرو۔ حیات اور کارنامے (انگریزی)۔

کندہ ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

زمیں را ازیں لوح شد سرفرازی   بدوران بابر شہنشاہ غازی

تاریخ وفات

میر خسرو، خسرو ملک سخن   آں محیط فضل و دریائے کمال
نثر او دلکش تر از مار مُعین   نظم او صافی تر از آب زلال
بلبل دبستان سرائے داد و دیں   طوطی شکر مقال بے مثال
از پئے تاریخ سال فوت او   چوں نہادم سر بزانوئے خیال
شد عدیم المثل[۱۲۲۵] یک تاریخ او   دیگرے شد طوطی شکر مقال[۱۲۲۵]

بیت

ز حرف وصل جاناں سادہ باید لوح خاک من   طریق سادہ لوحی بس نشان عشق پاک من

★★★★★

۴

ہم امیر خسرو کے بارے میں انھیں ان کے پر اسرار عالم روح کے قائد و مرشد حضرت نظام الدین اولیا سے الگ کر کے سوچ ہی نہیں سکتے، خسرو پر ان کی جو نگاہ شفقت و مرحمت تھی ہم اس کی تفصیلات کا اعادہ اس مختصر سی صحبت میں نہیں کر سکتے، درحقیقت حضرت سلطان المشائخ کے عظیم ترین کارناموں میں خود خسرو بھی ہیں اور اس احسان کا اعتراف خود خسرو نے بھی کیا ہے، آپ انھیں حضرت سلطان المشائخ سے الگ کر لیجیے تو ان کا وجود تقریباً کالعدم ہو جاتا ہے۔ آپ نے خسرو پر جو اثر ڈالا وہ کم ہی کسی پر دیکھا گیا ہے اور تقدس و معرفت کی جو معجز نمائی آپ نے ان کے ذہن بلکہ ان کے پورے وجود پر کی اس کے نقش بہت نمایاں طور پر ان کے کردار پر نظر آتے ہیں۔ یہ دائمی نقوش بہت ابھرے ہوئے اور بہت واضح ہیں۔ خسرو کی داستان حیات تقریباً ناگفتہ رہے گی اگر اس خاص کردار کے خط و خال واضح طور پر بیان نہ کیے جائیں جس کی وجہ سے ان کی داخلی اور خارجی صلاحیتیں بارآور ہوئیں۔

محمد نظام الدین جو ”محبوب الٰہی‘ سلطان الاولیا‘ سلطان المشائخ“ اور ”سلطان جی“ کے محبوب اور مقدس الفاظ سے یاد کیے جاتے ہیں، ۲۷ صفر ۶۳۴ھ (مطابق ۱۲۳۶ء) بروز چہارشنبہ بعد از طلوع آفتاب حضرت بی بی زلیخا کے بطن سے پیدا ہوئے، آپ کے پدر بزرگوار کا اسم گرامی سید احمد تھا اور آپ کے نانا خواجہ عرب تھے، جب آپ پانچ سال کے ہوئے تو آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا، اب آپ کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری آپ کی مادر گرامی پر آن پڑی، انھوں نے ان گنت مشکلات کے باوجود آپ کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا۔ آپ کے پہلے استاد مولانا علاء الدین اصولی تھے اور انھوں نے آپ کی دیکھ بھال بڑی مشقت و احتیاط سے کی۔

حضرت سلطان المشائخ کی ابتدائی زندگی صبر و قناعت کا ایک نادر نمونہ تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا

کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہ ہوتا، ایسے موقعوں پر آپ کی والدہ محترمہ آپ سے فرماتیں کہ "آج ہم لوگ خدا کے مہمان ہیں" آپ خود بیان فرماتے کہ جب کبھی آپ یہ الفاظ سنتے تو آپ ایک وجد آفریں اور ناقابل بیان حظ و مسرت کی کیفیت محسوس کرتے، بدایوں میں آپ کی زندگی کے شب و روز یوں ہی بسر ہوتے رہے یہاں تک کہ ۱۶ سولہ سال کی عمر میں آپ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ دلّی تشریف لائے اس وقت دلّی کے تخت پر سلطان ناصرالدین محمود متمکن تھا اور زمام اقتدار غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں تھی۔ اس زمانہ میں دلّی میں مولانا شمس الدین خوارزمی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا، آپ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور اس سرچشمۂ علم و فضل سے اتنا سیراب اور فیض یاب ہوئے کہ مولانا نظام الدین کہے جانے لگے، علم و فضل کا جو عظیم خزانہ آپ نے حاصل کیا تھا اس سے آپ مطمئن نہیں تھے اور برابر کسی چیز کی کمی محسوس کرتے رہتے تھے، اپنے قلب پر ایک بار محسوس کرتے اور اپنے دوستوں اور احباب سے فرماتے کہ "میں زیادہ دنوں تک آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔

قبل اس کے کہ آپ ذاتی طور پر حضرت بابا فریدالدین گنج شکر سے شرف نیاز حاصل کرتے آپ ان کی طرف ایک مخفی کشش محسوس کرتے، جب کبھی بھی حضرت باباصاحب کا ذکر ہوتا آپ بہت خوش ہوتے اور اکثر نماز کے بعد ان کے نام کا ورد کرتے، دلّی ہی میں حضرت باباصاحب کے چھوٹے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل بھی رہتے تھے، ان کے مکان کے قریب جو مسجد تھی اُسی کے حجرے میں حضرت سلطان المشائخ بھی قیام پذیر تھے۔ آپ اکثر حضرت نجیب الدین متوکّل کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، اس آمد و رفت نے آپ کے اشتیاق میں اور بھی اضافہ کر دیا، بالآخر آپ نے اجودھن، حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا، الغرض آپ حضرت باباصاحب کی خدمت میں ۱۰ر رجب المرجب ۶۵۵ھ بروز چہار شنبہ حاضر ہوئے اور شرف قدم بوسی حاصل کیا[1] جب آپ کی حاضری حضرت باباصاحب کی خدمت میں ہوئی تو انھوں نے یہ شعر پڑھا

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

---

[1] حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا۔ راحت القلوب، ملفوظات حضرت بابا فریدالدین گنج شکر۔

(ترجمہ : اے وہ ذات کہ تیری جدائی کی آگ نے دلوں کو کباب کر دیا اور تیرے عشق
کے سیلاب نے معلوم نہیں کتنی جانوں کو تباہ و برباد کر دیا)

اسی موقعہ پر جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی آپ نے حضرت بابا صاحب سے شرف بیعت حاصل کیا اور اس طرح آپ کی تاریخ حیات میں ایک نئے باب کا اضافہ و آغاز ہوتا ہے ، بیعت کے بعد حضرت بابا صاحب نے آپ کی تعلیم و تربیت کی جانب خاص توجہ کی اور آپ کو حضرت شہاب الدین سہروردی کی کتاب " عوارف المعارف " کے ابتدائی چھ باب بالاستیعاب پڑھائے اور چند ایسی کتابوں کی بھی تعلیم دی جن کی ضرورت حضرت بابا صاحب نے محسوس کی ۔ آٹھ ماہ بعد ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ کو حضرت بابا صاحب نے حضرت سلطان المشائخ کے سر پر دستار مبارک رکھی ، عصا دیا ، خرقہ خواجگان چشت پہنایا ، شکرانے کی دو رکعت نماز ادا کرائی اور حضرت شیخ بدر الدین اسحٰق سے سند خلافت لکھوا کر عطا فرمائی اور بغل گیر ہو کر ارشاد فرمایا " جاؤ خدا کو سونپا " حضرت بابا صاحب کا حکم پا کر آپ دلی واپس آئے اور خلق کی رہنمائی اور دل جوئی کے اہم فرض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے ۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار آپ اجودھن (پاک پٹن) گئے ۔ آپ کے ساتھ آپ کے ایک ہم جماعت عالم بھی ساتھ تھے ۔ انھوں نے جب حضرت سلطان المشائخ کو پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو اظہار افسوس کیا اور مشورہ دیا کہ آپ مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیں جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی ۔ آپ نے اپنے دوست کے اس پرخلوص مشورہ کو سنا اور معذرت کر دی ، جب حضرت سلطان المشائخ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے بغیر کسی سوال کے فرمایا :

" نظام ! اگر تم اپنے کسی دوست سے ملو اور وہ تم سے یہ پوچھے کہ تم نے اپنے آپ کو اس پست معیار تک کیوں پہنچا دیا ہے ؟ تم نے کیوں مدرسی کے ایسے پیشے کو خیر باد کہہ دیا جس سے تم دولت جمع کر سکتے تھے اور فارغ البال ہو سکتے تھے اور یہ کہ تم یہاں اس حالت میں کیوں ہو ؟ تو تمھارا کیا جواب ہوگا ؟" حضرت سلطان المشائخ نے بکمال عجز جواب دیا " پیر و مرشد کا جو حکم ہو " حضرت بابا صاحب نے فرمایا کہ " جب کبھی تم سے کوئی شخص اس طرح کا سوال کرے تو تمھارا جواب یہ ہونا چاہیے :

نہ ہمرہی تو مرا، راہ خویش گیر و برو
ترا سلامتی بادا، مرا نگوں ساری

(ترجمہ: تو میرا ساتھی نہیں ہے، اپنی راہ پکڑ اور جا، خدا کرے تجھے فارغ البالی حاصل ہو اور مجھے مسکنت)

ایک دوسرے موقع پر حضرت باباصاحب نے اپنا لعاب دہن حضرت سلطان المشائخؒ کے منہ میں رکھا اور یہ فرماتے ہوئے کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دنیاوی اور روحانی مسرتیں مقدر کردی ہیں" حضرت سلطان المشائخؒ سے قرآن شریف حفظ کرنے کے لیے کہا، آپ نے ترک و فقر کی زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی۔ جب حضرت سلطان المشائخؒ نے اپنا خلافت نامہ حضرت مولانا جمال الدین ہانسوی کو دکھلایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ؎

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

(ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے موتی، موتی کے پارکھ کو بخشا)

حضرت باباصاحب نے حضرت سلطان المشائخؒ سے ایک موقع پر فرمایا کہ "تم ایک زبردست سایہ دار درخت ہوگے جس کے سایہ کے نیچے خلق خدا آرام کرے گی"

اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق حضرت سلطان المشائخؒ دلّی میں قیام پذیر ہوگئے جہاں آپ کو روحانی فتوحات کرنی تھیں اور خلق خدا کو روحانی علوئے مرتبت کی راہ پر لگانا تھا۔ یوں تو دلّی میں آپ نے مختلف مقامات پر قیام کیا لیکن بالآخر غیاث پورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔ اس فیصلہ پر پہنچنے سے قبل آپ دنیاوی زندگی کی ہمہ ہمی سے دور کسی ویرانہ میں قیام کرنا چاہتے تھے لیکن ایک روز مردان غیب میں سے ایک خوش جمال شخص نمودار ہوا اور اس نے یہ اشعار پڑھے ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی   کانگشت نمائے جہاں خواہی شد
امروز کہ زلفت دل خلقے بر بود   درگوشہ نشستنت نمی دارد سود

(ترجمہ:۔ جس روز تو چاند بنا کیا نہیں جانتا تھا کہ دنیا تیری طرف انگلی اٹھائے گی؟

آج جب کہ تیری زلف ایک عالم کے دل کو اچک لے گئی تیرے ایک گوشے میں بیٹھنے سے کوئی فائدہ نہیں)۔

پھر اس نوجوان نے آپ کو ہمت دلائی اور دنیا سے فرار حاصل کر کے گوشۂ عزلت میں بیٹھنے سے باز رکھا، جیسے ہی آپ غیاث پورہ (موجودہ بستی حضرت نظام الدین) میں اقامت گزیں ہوئے، آپ عوام و خواص کا محور عقیدت بن گئے، شہزادگان و امرا، علما و دانشور اور عارف و عامی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیض و مستفید ہوتے۔ غیاث پورہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد بھی برسوں تک یہ کیفیت رہی کہ آپ اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر پاتے تھے لیکن ایک وقت وہ آیا جب عسرت اور تنگی کے یہ دن ختم ہوئے اور یہ عالم ہو گیا کہ مطبخ کا خرچ اور اور فقرا و مساکین کو جو خیرات دی جاتی تھی دو ہزار تنکہ یومیہ ہوتی تھی، آنے والوں میں کوئی بھی خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا، جو چیز بھی فتوح اور نذرانے کے طور پہ آتی تھی۔ فوراً فقیروں اور ضرورتمندوں کو دے دی جاتی تھی اور جب کچھ بھی نہ رہ جاتا تھا تو آپ کو ایک روحانی سکون اور طمانیت حاصل ہوتی، خود آپ ہمیشہ روزے رکھتے لیکن آپ کا دسترخوان بلا کسی تخصیص و تمیز دوسروں کے لیے بچھا رہتا تھا۔ آپ سحر و افطار کے وقت بھی برائے نام ہی کھاتے اور سارا کھانا واپس فرما دیتے۔ جب اصرار کیا جاتا تو فرماتے "اللہ کے ہزاروں مسکین بندے سڑکوں پر، دکانوں کے تختوں پر اور مسجدوں کے کونوں میں بھوکے پڑے رات گزار رہے ہیں، یہ کھانا نظام الدین کے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے[1]۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا "آن قدر غم و اندوہ کہ مراست ہیچ کس را دریں جہاں نیست زیرا کہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہ خویش می گویند ہمہ بر دل و جانِ من می نشینند[2]" (جو غم و اندوہ مجھے ہے وہ دنیا میں کسی کو بھی نہیں ہے کیونکہ ایک عالم میرے پاس آتا ہے اور اپنا غم بیان کرتا ہے اور سب کا سب میرے دل اور جان پر طاری ہوتا ہے) الغرض آپ کی خانقاہ خستہ دلوں، پریشان حالوں، دردمندوں، حاجتمندوں، دلگیروں، وقت کی گردش کے مارے ہوؤں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کا مامن و ملجا تھی، آپ ہر شخص کی دست گیری اور

---

[1] امیر خورد: سیر الاولیا، مورد ڈاکٹر نثار احمد فاروقی؛ تذکرہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء۔

[2] حمید قلندر خیر المجالس۔

دل جوئی فرماتے اور ہر شخص مطمئن اور مسرور ہو کر واپس جاتا۔

دلّی میں اپنی تشریف آوری اور اپنی وفات کے درمیان حضرت سلطان المشائخؒ نے پانچ بادشاہوں کا دور دیکھا لیکن کبھی بھی کسی سے کوئی تعلق نہ رکھا، ایک بار کے علاوہ آپ کبھی بھی دربار شاہی میں نہیں گئے اور نہ آپ نے کسی بادشاہ کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ آپ کے پاس آئے۔ سلطان جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی نے بہت کوشش کی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن آپ راضی نہ ہوئے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "میرے مکان میں دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک سے آئے گا تو میں دوسرے سے باہر نکل جاؤں گا" ایک مرتبہ جلال الدین خلجی نے امیر خسروؒ کو اپنے اعتماد میں لے کر حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ امیر خسروؒ نے آپ کو سلطان کے ارادہ سے باخبر کر دیا اور قبل اس کے کہ سلطان اپنے ارادہ کو عمل میں لاتا آپ اجودھن چلے گئے۔ سلطان کو جب معلوم ہوا تو اس نے امیر خسرو سے دریافت حال کیا، انھوں نے جواب دیا کہ سلطان کو ناراض کر کے میں دنیا کو کھوتا لیکن حضرت سلطان المشائخؒ کو ناراض کر کے میں آخرت کی رحمتوں سے محروم ہو جاتا۔ ان تمام باتوں سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا اور دنیاداری سے آپ کو کس قدر گریز تھا۔ اقبال کے لفظوں میں آپ ان لوگوں میں نہ تھے جو آفاق میں گم ہو جاتے ہیں بلکہ آپ کا شمار ان اصحاب کبار میں تھا جن میں آفاق خود گم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اپنے باپ کے برخلاف حضرت سلطان المشائخؒ سے اچھے تعلقات نہ رکھتا تھا اس کا سبب اس کا بڑا بھائی خضر خاں تھا جس کو اس نے اندھا کرا کے تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا۔ خضر خاں حضرت سلطان المشائخؒ کے معتقدوں میں تھا۔ سلطان کا یہ خیال تھا کہ آپ کو اس سے ہمدردی ہے، سلطان آپ سے اس قدر کبیدہ تھا کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ لوگوں کا غیاث پور جانا ممنوع قرار دے دیا، اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ حکم بھی صادر کر دیا کہ تمام مشائخ و صوفیا مہینہ میں ایک بار اس کے دربار میں حاضری دیں، امیر خسروؒ کے قول کے مطابق وہ اکثر کہا کرتا کہ جو بھی آپ کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو ایک ہزار تنکہ انعام دیا جائے گا۔ آخر کار اس نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار ایک فرمان میں کیا جس کی رو سے حضرت سلطان المشائخؒ کو اس کے دربار میں آنے والی چاند کی پہلی تاریخ کو حاضر ہونا تھا، بصورت دیگر اس

کو معلوم ہے کہ انھیں کس طرح دربار میں لایا جا سکتا ہے۔ بادشاہ کا یہ خوفزدہ اور اوسان خطا کر دینے والا فیصلہ آپ تک پہنچایا گیا۔ آپ نے سکوت فرمایا اور کسی بھی ردعمل کا اظہار نہ کیا، وقت گزرتا رہا اور متعینہ ساعت قریب آتی گئی، نئے مہینہ کا چاند دکھائی دیا۔ اس فیصلہ کن لمحہ کے آنے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے، حضرت سلطان المشائخ کو کسی طرح بھی راضی نہ کیا جا سکا، نہ ہی بادشاہ اپنے فیصلہ کو تبدیل کرنے کے لیے تیار ہوا، دونوں ہی چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور دنیا اس متعینہ وقت کا انتظار کرتی رہی، وہ وقت تو کبھی نہیں آیا لیکن وہ ساعت ضرور آگئی جو قطب الدین خلجی کی موت کے لیے مقدر ہو چکی تھی اور اسی رات اس کے مختار کل خسرو خاں نے اسے بے رحمی سے قتل کر کے اس کا سر قصر ہزار ستون کے نیچے فرش پر پھینک دیا۔ امیر خسرو کی مثنوی "تغلق نامہ" سے مبارک خلجی کے قتل کے دن اور تاریخ کی تصدیق ہوتی ہے یہ مثنوی انھوں نے غیاث الدین تغلق کے دور میں لکھی، امیر خسرو کہتے ہیں ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفصد وبیست   ثبات قطب شد کجانب زلیست
جماد دومیں را شد پدیدار   ہلال تیرہ و تاریک دیدار
مہ باریک بود از حالت تلخ   بناخن کردہ خود راپیش ازاں سلخ۔

شد آں مہ برہمہ گیہاں مبارک
مگر برطالع سلطاں مبارک [1]

(ترجمہ: جب ہجری حساب سے ۷۲۰ھ ہوا تو زندگی کی جانب قطب کا ثبات کم ہو گیا۔

جمادی الثانی کا مہینہ تھا جس میں وہ منحوس چاند طلوع ہوا۔

چاند بہت باریک تھا، وہ ناخن کی طرح ظاہر ہوا۔

وہ چاند سوائے قطب الدین مبارک شاہ کے سب کے لیے مبارک ہوا)

جو حقائق اور تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عوام و

---

[1] امیر خسرو: مثنوی تغلق نامہ۔

خواص، ادنا و اعلا، عارف و عامی اور شاہ و گدا کے دلوں پر حضرت سلطان المشائخ کا کتنا زبردست اثر تھا، یہ مرد درویش اپنے جامۂ پشمیں میں پرسطوت و پرشکوہ شہنشاہوں اور بادشاہوں سے بے نیاز، دنیا کی ساری آسائشوں سے بے خبر، راضی برضائے الہٰی ہو کر، احکام خداوندی کی اطاعت گزاری میں اپنے گوشۂ خانقاہ میں توکل اور قناعت کے ساتھ بیٹھ کر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا، صراط مستقیم کی جانب ان کی رہنمائی کرتا، روحانی امراض کا علاج کرتا اور انھیں ان سے نجات دلاتا اور اس پُراسرار کائنات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کرتا، خود صائم الدہر رہتا لیکن جو آتے ان کو شکم سیر کرتا اور ایک ایک دانہ تقسیم کرا دیتا۔ سچ ہے اقبالؔ نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند   زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اندو کمندے بمہر و مہ پیچند   بخلوت اندو زمان و مکاں در آغوشند

حضرت سلطان المشائخ کو بادشاہوں کا کوئی خوف نہ تھا، صرف ایک بار دربار شاہی میں گئے اور وہ بھی ایک دینی مسئلہ، محفل سماع، کی حلت و حرمت کے سلسلہ میں، سماع کی یہ محفلیں آپ کی خانقاہ میں اکثر و بیشتر منعقد ہوا کرتی تھیں، دشمنوں نے بادشاہ وقت غیاث الدین تغلق کے کان ان محفلوں کے خلاف بھرے اور اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ کو سر دربار اس سلسلہ میں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے طلب کیا جائے۔ آپ کے پاس سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ آپ دربار شاہی میں جاتے اور سماع کا جواز پیش کرتے، چنانچہ آپ دربار شاہی میں تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی بھی تھے۔ اس موقعہ پر قاضی جلال الدین نائب حاکم نے گستاخانہ خطاب کیا، الغرض یہ کہ مناظرہ و مباحثہ شروع ہوا اور فریقین نے اپنے دلائل پیش کرنے شروع کر دیے۔ اخیر میں مولانا جلال الدین نائب حاکم نے بادشاہ سے سماع کی حرمت میں فرمان صادر کرنے کو کہا لیکن حضرت سلطان المشائخ نے بادشاہ کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ بادشاہ نے بھی آپ کے مشورہ کو قبول کیا، — صاحب سیر الاولیا نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس واقعہ سے قبل یا بعد کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا، جس سے کبھی دربار شاہی میں آپ کا جانا ثابت ہو، یہ ایک آزمائش تھی اور آپ اس سے بھی فیروزمندانہ گزر گئے۔

امیر خسرو کو اتنی قربت حاصل تھی کہ جب حضرت سلطان المشائخ رات کو آرام کرنے کے لیے تشریف لے جاتے تو اس وقت سوائے امیر خسرو کے کسی کو بھی باریاب ہونے کی اجازت نہ تھی، وہ آپ کو تمام حالات سے مطلع کرتے، حضرت سلطان المشائخ اکثر خسرو سے فرماتے "من از ہمہ تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم واز تو تنگ نیایم" (میں سب سے تنگ آجاتا ہوں یہاں تک کہ خود سے بھی تنگ آجاتا ہوں مگر تم سے نہیں) حضرت سلطان المشائخ کی نگاہ شفقت خسرو پر اس قدر تھی کہ آپ نے فرمایا "اگر مذہب اجازت دیتا تو میں یہ وصیت کرتا کہ خسرو کو بھی میری قبر میں دفن کیا جائے" آپ نے انھیں ترک اللہ کا بھی خطاب دیا تھا اور عام طور پر اسی سے مخاطب فرماتے۔ خسرو سے آپ اکثر غزل سنانے کی فرمائش کرتے، ایک بار آپ نے انھیں صفاہانیوں کے طرز پر غزل کہنے کے لیے فرمایا جن میں عشق و محبت کی آگ بھری ہو، جو اشک و آہ سے معمور ہوں اور جن میں زلف و خال کی باتیں ہوں، آپ کی درج ذیل رباعی امیر خسرو ہی کی شاعرانہ استعداد کے اعتراف میں ہے ؎

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست، ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدا ناصر خسرو ماست

(ترجمہ:- خسرو کہ نظم و نثر میں اس جیسے کم پیدا ہوئے ملک سخن کی ملکیت اسی خسرو کے لیے ہے۔)

وہ ہمارا خسرو ہے، ناصر خسرو نہیں ہے اور خدا خود اس خسرو کا مددگار ہے)

ایک دن حضرت سلطان المشائخ کے حضور میں خسرو کوئی غزل گا رہے تھے اور آپ سن رہے تھے۔ جب خسرو نے درج ذیل شعر پڑھا تو آپ نے خسرو کو مشفقانہ نگاہوں سے دیکھا اور آپ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی ؎

رخ جملہ رانمود و مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست و بے خبرم کیں سخن چہ بود

(ترجمہ:- اُس نے سب کو اپنا چہرہ دکھایا اور مجھ سے کہا کہ تُو مت دیکھ، میں اتنی ہی بات سن کر مست و بے خبر ہو گیا کہ یہ کیا بات تھی)

اسی طرح ایک روز امیر خسرو کے لڑکے امیر حاجی اپنے والد کی غزل پڑھ رہے تھے، جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

خسروؔ تو کیستی کہ در آئی دریں شمار کیں عشق تیغ بر سرِ مردانِ دیں زدہ است

(ترجمہ:- خسرو تو کون ہے کہ اس شمار میں آئے، عشق نے تو اپنی تلوار مردانِ دین
پر چلائی ہے)

تو آپ پر پھر ایک ناقابلِ بیان نشاط کی کیفیت طاری ہو گئی، جب امیر حاجی نے اس کی تکرار کی تو آپ بہت مسرور ہوئے اور اپنی ایک کلاہ امیر حاجی کو بخش دی اور ایک امیر خسرو کو عطا کی۔

حضرت سلطان المشائخؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں بغیر امیر خسرو کو ساتھ لیے جنّت میں نہ جاؤں گا اور یہ کہ میں اللہ سے اس تُرک کے سوزِ سینہ کے طفیل میں بخشش و غفران کا طلبگار ہوں گا۔ حضرت سلطان المشائخؒ کی مدح کرتے ہوئے امیر خسرو اپنے خطاب "تُرک اللہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بر زبانت چوں خطابِ بندہ تُرک اللہ رفت دستِ تُرک اللہ گیر وہم بہ اللّٰہش سپار

(ترجمہ: جب آپ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے تُرک اللہ فرمایا تو تُرک اللہ
کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اللہ کے سپرد فرما دیجیے۔)

امیر خسرو کو حضرت سلطان المشائخؒ کے دیے ہوئے اس خطاب پر بہت فخر تھا اور آپ بھی انھیں "تُرک" ہی کہہ کر مخاطب کرتے، ایک موقعہ پر آپ نے یہ شعر بھی ارشاد فرمایا ؎

گر زبہرِ ترک تُرکم ارّہ بر تارک نہند ترکِ تارک گیرم واما نہ گیرم ترکِ تُرک

(ترجمہ: اگر تُرک سے قطع تعلق کرنے کے لیے میرے سر پر آرہ رکھا جائے تو میں
اپنے سر کو دے دوں گا لیکن ترک کو نہ چھوڑوں گا)

ان تمام واقعات سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امیر خسروؔ سے حضرت سلطان المشائخؒ کو کتنا تعلقِ خاطر تھا اور ان پر کتنی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے انھیں خلافت نہیں عطا کی۔ امیر خسرو کے معاصرین مثلاً شمس الدین یحییٰ، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دلّی، شیخ قطب الدین منور اور مولانا حسام الدین ملتانی اس سے مشرف ہوئے، اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت سلطان المشائخؒ کے معیار کے مطابق ہر شخص اس نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا، اس کے کچھ اصول اور ضابطے تھے، پہلے ان پر جانچا اور پرکھا جاتا تھا پھر فیصلہ کیا جاتا تھا، اس معاملہ میں حضرت سلطان المشائخؒ نے یہی کیا، امیر خسرو پر آپ کی جو نگاہِ شفقت تھی اس کو آپ

نے اس راہ میں آنے نہیں دیا اور یہ مناسب نہیں سمجھا کہ انھیں خلافت عطا کی جائے۔

حضرت سلطان المشائخؒ کی وفات ۱۸/ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (مطابق ۳ اپریل ۱۳۲۵ء) بروز چہار شنبہ عصر و مغرب کے درمیان ہوئی، چالیس روز قبل ہی سے آپ پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی، ایک وقت کی نماز کئی بار ادا فرماتے، بار بار سجدہ میں سر لے جاتے اور فرماتے "دوست کو دوست کا وعدہ یاد ہے" اور کبھی کبھی یہ مصرع پڑھتے ؎

می رویم و می رویم و می رویم

ایک روز آپ نے اپنے تمام ملازمین اور مریدین کو طلب فرما کر کہا "تم لوگ اس بات کے گواہ رہنا کہ اگر اقبال (آپ کے ملازم خاص) نے گھر میں ایک دانہ بھی بچا لیا ہے تو وہ قیامت کے روز خدا کے حضور اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔" خواجہ اقبال پہلے سب کچھ تقسیم کر چکے تھے لیکن صرف اس قدر غلّہ بچا لیا تھا جو چند روز تک ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے لیے کفایت کرتا۔ حضرت سلطان المشائخؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے سارے فقرا و مساکین کو طلب کیا اور جب وہ لوگ آ گئے تو آپ نے غلّے کے گودام کو کھول دینے کا حکم دیا، اس کی تعمیل کی گئی اور فقرا و مساکین نے ایک ایک دانہ لوٹ لیا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا تو آپ کو اطمینان حاصل ہوا، اس کے بعد آپ نے اپنے خلیفہ اجل حضرت شیخ نصیر الدین محمود کو طلب فرما کر خرقہ، عصا، مصلّا، تسبیح اور کاسۂ چوبیں عطا فرمایا اور پھر جان شیریں، جاں آفریں کے سپرد کر دی اور اسی جگہ جہاں آپ کا مزار مقدس مرجع خلائق ہے مدفون ہوئے، بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا، کسی نے خوب قطعۂ تاریخ وفات کیا ہے جو درگاہ میں دیوار مسجد پر کندہ ہے:-

نظام دو گیتی، شہ ماء و طیں　　سراج دو عالم شدہ بالیقیں
چو تاریخ فوتش بجستم ز غیب　　ندا داد ہاتف شہنشاہ دیں
۷۲۵ھ

امیر خسرو حضرت سلطان المشائخؒ کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اے شربت عاشقی بجامت　　وز دوست زماں زماں پیامت
در سیر وصال، ہر دو عالم　　داخل بمسافت دو گامت
شد سلک فرید از تو منظوم　　زانست کہ شد لقب نظامت

صدجان شریف پاک را چرخ   بگداخته و نوشته نامت
درگاه تو قبله و ملائک   پرّاں چوں کبوتراں ببامت
سودا زدگانِ شوقِ حق را   تسکیں ز مفرح کلامت
جاوید بقاست بندہ خسرو
چوں شد بہ ہزار جاں غلامت

(ترجمہ : اے وہ ذات کہ تیرے جام میں عشق الٰہی کا شربت ہے اور ہر وقت دوست حقیقی کے پاس سے تجھ تک پیام پہنچتے رہتے ہیں۔
محبوب حقیقی کے وصال کی منزل کی راہ میں یہ دونوں عالم تیرے دو قدم کے برابر ہیں۔
تو نے حضرت بابا فریدؒ کے ہار کو گوندھا، اسی لیے تیرا لقب نظام ہوا۔
آسمان نے سیکڑوں پاک اور مقدس جانوں کو پگھلایا تب جاکر تیرا نام لکھا۔
تیری درگاہ قبلہ ہے اور اس پر فرشتے اس طرح اڑتے ہیں جیسے تیری چھت پر کبوتر۔
جن لوگوں کے سر میں عشق الٰہی کا سودا ہے ان کو تیرے فرحت بخش کلام سے تسکین ہوتی ہے۔
اس غلام خسروؒ کو اسی وقت ہمیشہ کی زندگی مل گئی جب وہ ہزار جان سے تیرا بندہ ہو گیا۔)

حضرت سلطان المشائخؒ نے اپنے خلفا و مریدین کی تربیت و پرداخت کچھ اس انداز سے کی تھی کہ ان میں سے جو بھی جہاں گیا اور جہاں بھی رہا اس نے حضرت سلطان المشائخؒ کی تعلیمات سے سرمو انحراف نہیں کیا اور آپ کی قائم کردہ روایات کو ان کی پوری تفصیلات کے ساتھ ملحوظ رکھا۔ زہد و تقویٰ، طہارت و پاکبازی، پابندی شریعت مطہرہ، توکل و قناعت، صبر و رضا، دلنوازی و دلسوزی، دعوت و عزیمت، ترک دنیا، شاہان وقت سے بُعد و بیزاری، مظلوموں کی فریاد رسی، بے چاروں کی چارہ گری، مجبوروں کی دستگیری، الغرض یہ کہ دین و دنیا کی فلاح و فوز کا وہ کون سا فریضہ تھا جو ان حضرات نے نہیں ادا کیا اور خود کو دنیا کی ہر لذّت، ہر کامرانی، ہر فیروزمندی اور ہر آسائش و عیش سے محروم رکھا۔ یہ حضرات تبلیغ و اشاعت اور دعوت ارشاد کی غرض سے اس برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئے اور ایسے بے آب و گیاہ علاقوں میں پہنچے جہاں ہر قدم پر آزمائش و ابتلا کا ایک نامتناہی سلسلہ تھا لیکن ان کے پائے استقلال میں

جنبش نہیں ہوئی، کوئی بنگال گیا، کسی نے دکن میں اپنی بساطِ فقر آراستہ کی، کسی نے اودھ کی سرزمین کو اپنا مورد بنایا، کوئی پنجاب میں سرگرم عمل ہوا اور کوئی ہر طرح کی صعوبتوں کے باوجود دلّی ہی میں رہ کر دادِ صبر و ثبات دیتا رہا۔ امیر خسرو نے آپ کے انھیں خلفا و مریدین کے لیے کہا ہے ؎

واں مریدان رہروان یقیں　　ہر یکے والیٔ ولایت دیں
زندہ دار شب از دم تسبیح　　غلغل افگندہ در رواق مسیح
ملک وحدت بنام ایشان است　　بندہ خسرو غلام ایشانست
نام من زاں ستودہ کیشاں باد
حشر من درمیان ایشاں باد

(ترجمہ؛ وہ مرید جو یقین کی راہ پر چلنے والے ہیں ان میں ہر ایک دین کے ملک کا والی ہے۔
اپنی تسبیح خوانی سے یہ لوگ رات کو زندگی بخشتے ہیں اور ان کی آواز چرخِ چہارم تک پہنچتی ہے۔
وحدت کا ملک ان لوگوں کے نام ہے اور یہ فقیر خسرو ان کا غلام ہے۔
خدا کرے میرا نام بھی ان اچھے لوگوں میں ہو اور میرا بھی حشر انھیں کے ساتھ ہو)

حضرت سلطان المشائخؒ کے فرمودات و تعلیمات کو آپ کے مریدین امیر حسن سنجری، امیر خورد اور مولانا ضیاء الدین برنی نے علی الترتیب فوائد الفواد، سیر الاولیا اور تاریخ فیروز شاہی میں محفوظ کر دیا ہے، ان کتابوں میں صداقت و درایت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور پھر ان کے لکھنے والوں کا ذاتی کردار بھی شک سے بالاتر ہے، کوئی سبب نہیں کہ ہم ان کے مندرجات پر یقین نہ کریں، یہ معتبر کتب حضرت سلطان المشائخؒ کے کردار کے ہر پہلو اور آپ کی زندگی کے ہر رخ پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ کردار آج بھی ایک زبردست اخلاقی اور روحانی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت سلطان المشائخؒ کا مزار غیاث پور ہی میں ہے لیکن آج وہ بستی حضرت نظام الدین کے نام سے مشہور ہے جو کوئی بھی وہاں جاتا ہے اس کے احساسات کو ایک زبردست دھکّا لگتا

ہے۔ اسی بستی میں تھوڑے ہی فاصلہ پر لوگوں کی توجہات مقبرۂ ہمایوں کے سطوت وشکوہ کی طرف مبذول ہوتی ہیں جو لوگوں کے لیے ایک تفریح گاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جب کہ حضرت سلطان المشائخ کا مزار فقرا، ومساکین، مجبوروں اور لاچاروں اور روحانی مریضوں کی روحانی پناہ گاہ ہے۔ ہر سال ایک مقررہ تاریخ اور وقت پر آپ کا عرس ہوتا ہے اور عوام الناس دور اور نزدیک سے بلاتفریق مذہب وملت و رنگ ونسل آپ کے مزار مقدس پر حاضر ہوکر اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں اور حضرت سلطان المشائخ کی برکات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ بہت ہی خاموش مگر مغموم انداز میں انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کی ہیچ مقداری کی تصویر پیش کرتا ہے۔

حضرت سلطان المشائخ دیگر درویشان باصفا کی طرح باقاعدہ شاعر نہ تھے لیکن درج ذیل اشعار تذکروں میں نظر آتے ہیں ؎

از تو نتواند بریدن کس بآسانی مرا   گرنمی داند کسم، آخر تو می دانی مرا
گر برنجانی زنجم، زانکہ رنجت راحت است   جانی و آرام جاں، آں دم کہ رنجانی مرا

وقت آں آمد کہ دل از ہر دو عالم بر کنم   ایں جہان و آں جہاں را درہم و برہم زنم
گر بگوید جاں بدہ، از چشم پیش وے کشم   ور بگوید سر بنہ، در پیش پایت افگنم
مرغ باغ قدسیم، با قدسیاں بودم بسے   چند گاہے شد کہ ہست ایں فرش خاکی مسکنم
چوں نظام از خوان ہستی گر نباید لقمہ۔   نیستی را قوت سازم، دیگ ہستی بشکنم

ہر ساعتے بدیدن دلدار می روم   ہر مسجدم بہ جانب گلزار می روم
پرسند دوستاں کہ کجا می روم نظام   گویم کہ عاشقم بہ بر یار می روم

ندارم رنگ رندی، نے ہوائے پاک دامانی   مرا دیوانۂ خود کن، بہر رنگے کہ می دانی

زاں روز کہ بندۂ تو خوانند مرا بر مردمک دیدہ نشانند مرا
لطف عامت، عنایتے فرمودست ورنہ چہ کسم، خلق چہ دانند مرا

ایک عارف باللہ ہی ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔

اس وقت سے لے کر اب تک دھیرے دھیرے کر کے خاموشی کے ساتھ کم و بیش پونے سات سو سال گزر چکے ہیں۔ ماہ و سال کی کتنی گردشیں آئیں اور چلی گئیں، شب و روز کے کتنے افسانے دہرائے گئے، صبح و شام کی کتنی داستاں سرائیاں ہوئیں، کیسے کیسے انقلابات آئے، زمانے نے کیسی کیسی کروٹیں لیں، سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا، شہنشاہوں اور شاہوں کی سطوت اور سربلندیاں زمیں بوس ہوئیں، کیسے کیسے ناموروں کے نام و نشاں مٹ گئے، عظیم صف شکنوں نے اپنی تیغ جوہردار کے جوہر دکھائے اور نذر گمنامی و فراموشی ہو گئے، الغرض یہ کہ تاریخ نے کتنے ہی پہلو بدلے۔ امن و امان اور مسرت و فارغ البالی کے مختصر وقفوں کے علاوہ یہ پر شور صدیاں آتش و خوں کے مناظر کے سوا اور کچھ نہیں پیش کرتیں لیکن زمانے کی تیز ہواؤں کے تند جھونکے اس چراغ کو ذرا بھی مدھم نہ کر پائے جو صدیوں پہلے روشن کیا گیا تھا۔ وہ اپنے ابدی اور سرمدی فروغ کے ساتھ جلتا رہا اور آج بھی اپنی اُسی خیرہ کن آب و تاب کے ساتھ جل رہا ہے اور نفرت و بیگانگی، وحشت و بربریت، بہیمیت و حیوانیت، ہوا و ہواس، حرص و طمع، خود غرضی و خود بینی، مکر و ریا، کبر و نخوت، تمرّد و طغیان کی تباہ کن اور ہلاکت خیز آندھیوں کا مقابلہ کر رہا ہے ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

امیر خسرو ایک ایسے عظیم عارف حق کی صحبت میں رہے، انھوں نے حضرت سلطان المشائخ سے اپنی عقیدت بے پاں کے سبب خود کو ان کا محبوب اور ان کی برکتوں کا مستحق بنا دیا تھا، خسرو کی ہمہ پہلو شخصیت اور ان کی عبقریت جو اس وقت کے معاشرہ میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی پورے طور پر حضرت سلطان المشائخ کی نگاہ فیض و کرم کی ممنون ہے۔ ایک باکمال شاعر، ایک نثر نگار،

ایک مؤرخ، ایک موسیقار، ایک ماہر لسانیات، ایک درباری، ایک صوفی اور سب سے بڑھ کر ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ان کا شمار بہترین انسانوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ اس طرح کی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، فطرت نے کتنی فیاضی کے ساتھ انھیں عقل و دل کی دولت عطا کی تھی۔ منقول ہے کہ ان کے نانا عماد الملک جو خود بھی حضرت سلطان المشائخؒ کے مریدوں میں تھے انھیں آٹھ سال کی عمر میں آپ کی خدمت میں لائے تھے، اس وقت سے ان پر حضرت سلطان المشائخؒ کی خاص نگاہ التفات رہی، وہ ۶۷۱ھ میں باقاعدہ طور پر آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر آپ کے دست حق پر بیعت ہوئے اور اس طرح حضرت سلطان المشائخؒ کی نگاہوں میں ان کی منزلت اور محبوبیت اور بھی بڑھ گئی، وہ باقاعدہ ایک صوفی ہو گئے اور حتی الامکان روزانہ دربار شاہی میں جانے سے گریز کرنے لگے، وہ بادشاہوں کی مدح کرتے لیکن ان کے تئیں اپنے فرائض کو فراموش نہیں کیا۔ وہ محفل طرب و مے نوشی میں موجود رہتے تھے لیکن کوئی بھی ہم عصر مؤرخ اس امر کی شہادت نہیں دیتا کہ وہ محرمات و متروکات کے کبھی قریب گئے۔ انھیں شاہوں اور شہزادوں سے وافر انعامات حاصل ہوتے لیکن وہ سب کا سب فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے، مزید براں وہ بلا تکلّف ہر طبقہ کے لوگوں سے ملتے اور اپنے فارسی ہندی آمیختہ اشعار پہیلیوں، معمّوں، چٹکلوں، دوسخنوں سے سب کو محظوظ کرتے، اپنے پیر و مرشد کے حضور میں وہ سراپا عجز و انکسار اور ہمہ تن اخلاص و عقیدت ہوتے۔

★★★★★

۵

مولانا شبلی نعمانی امیر خسرو کی جامعیت کمالات پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں؛

> "ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی نظمیں، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں[1]"

محولا بالا اقتباس میں مولانا شبلی نے دیگر شعرا کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے اختلاف عین ممکن ہے لیکن جہاں تک خسرو کا تعلق ہے اس سے سوائے اتفاق کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں، قصیدہ کے میدان میں وہ خاقانی سے کم نہیں، مثنوی میں وہ مولانا نظامی گنجوی جیسے باکمال سخنور اور استاد سے پیچھے نہیں رہتے اور مزید برآں وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جس نے ایسے شجاع سخن کے مقابلے میں آنے کی جرات کی، جب وہ عشق و حسن کی باتیں کرتے ہیں تو وہ سعدی، حافظ، اور عرفی کا دل جیت لیتے ہیں، درج ذیل شعر میں حافظ

---

[1] مولانا شبلی نعمانی : شعر العجم، جلد دوم۔

نے خسرو کے سوا کسی اور کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند   کیں قند پارسی کہ بہ بنگالمی رود

عرفی یوں مدح سرا ہوتا ہے ؎

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم   کہ کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

مولانا جامی درج ذیل ابیات میں امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

آں دو طوطی کہ بنو خیزی شاں   بود در ہند شکر ریزی شاں
عاقبت سخرۂ افلاک شدند   خامشان قفس خاک شدند

صائب اصفہانی نے خسرو کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر اور خسرو کے اشعار پر تضمین کر کے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو اس کا دوسرا مصرعہ خسرو کا ہے ؎

ایں آں غزل خسرو معنی است کہ فرمود   خوبان عمل فتنہ ز دیوان تو یابند

میر غلام علی آزاد بلگرامی امیر خسرو کے مصرعوں پر تضمین کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اے خسرو شوخاں چہ کند وصف تو آزاد   خوبان عمل فتنہ ز دیوان تو یابند

میر خسرو نمکیں شعر ترا خواند آزاد   از نمکدان تو شد تازہ گرفتاری دل

کاتبی نیشاپوری کہتا ہے ؎

گر حسن معنی ز خسرو بُرد نتواں عیب کرد   زانکہ استاد است او بلکہ ز استاداں زیاد

خواجہ عصمت اللہ بخاری درج ذیل اشعار میں اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کرتے ہیں ؎

میر خسرو را علیہ الرحمہ شب دیدم بخواب   گفتم ایں عصمت ترا یک خوشہ چین خرمن است
شعر او از شعر تو چوں بیشتر شہرت گرفت   گفت با کے نیست شعر او ہمیں شعر من است

فیضی اور ہلالی بھی خسرو کو اپنے استادوں میں شمار کرتے ہیں، غالب جو فیضی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے امیر خسرو کے حضور میں سراپا انکسار ہو جاتے ہیں، ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی

بعض غزلیں خسرو کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی ہیں، مثلاً خسرو کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

تنگ نبات چوں شود، لب بکشا کہ ہم چنیں   آب حیات چوں رود، خیز و بیا کہ ہم چنیں

غالب کی مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں   بوسے کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

بحر وہی ہے، قافیہ بھی وہی ہے، غالب نے صرف ردیف "ہم چنیں" کا ترجمہ کر دیا ہے، خسرو کی ایک دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

زاں چشم تو کہ ہست ز تو جاں شکار تر   دل نیست در جہاں ز دل من فگار تر

غالب نسخۂ حمیدیہ کی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

اے چرخ خاک بر سر تعمیر کائنات   لیکن بنائے عہد وفا استوار تر

اگر اس زمانہ میں حافظ کا کلام ہندوستان آسکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ خسرو کا کلام حافظ تک پہنچا ہو، خسرو حافظ سے پہلے ہوئے اور دونوں کی وفات کی تاریخ میں ستاون سال کا فرق ہے، حافظ کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

دوش سودائے رخت گفتم ز سر بیروں کنم   گفت کو زنجیر تا تدبیر ایں مجنوں کنم

اسی زمین میں خسرو کا ایک مقطع ملاحظہ ہو ؎

روح لیلیٰ آید و آموزد آیتہائے عشق   شعر خسرو گر رقم بر تربت مجنوں کنم

اگر حافظ نے خسرو کی غزل پر کوئی غزل لکھی تو یہ بھی ایک طرح کا خراج عقیدت ہے،

اس بیسویں صدی میں اقبال جیسا عظیم شاعر خسرو کی عظمت کا معترف ہے ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی   ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

اقبال ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

خسرو شیریں زباں، رنگیں بیاں   نغمہائش از ضمیر کن فکاں
فطرتش روشن، مثال ماہتاب   گشت از بہر سفارت انتخاب
چنگ را پیشش قلندر چوں نواخت   از نوائے شیشۂ جانش گداخت
شوکت کوہِ پختہ چوں کہسار بود   قیمت یک نغمۂ گفتار بود[1]

---

[1] مثنوی اسرار خودی ؛ اقبال۔

امیر ہاشمی کرمانی مولانا جامی کا ایک قریب العہد ایرانی شاعر گزرا ہے، اس نے مولانا نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کے تتبع میں ایک مثنوی "مظہر الآثار" لکھی، اس میں اس نے امیر خسرو کے بارے میں درج ذیل اشعار لکھے ہیں ؎

چوں زقضا لائحۂ نو رسید　　کوکبۂ نوبت خسرو رسید
خامہ برآورد بفکر جواب　　ماند قلم بر ورق آفتاب
خامۂ خسرو چو گہر بار شد　　نامۂ او مطلع انوار شد
کرد دراں نامہ تکلف بسے　　گفت جوابے کہ نگوید کسے
بزم سخن را بسخن ساز کرد　　بر ہمہ کس راہ سخن باز کرد
فہم رموزش نکند ہر کسے　　زانکہ معانیست بسے در بسے
زبدۂ اسرار حقائق ہمہ　　محض اشارات دقائق ہمہ
گفتۂ او در نظر نکتہ داں　　می دہد از علم لدنی نشاں
آنچہ دریں مائدہ افگند شور　　سر بر از قوت طبع ست و زور
ایں مۓ صاف از قدح دیگر است　　مستی او را فرح دیگر است
ہست دریں بزمگہ دل فروز　　نوبت ہر اہل دلے پنج روز
دور قدح طے شد و ساقی نماند　　در خم دوراں مۓ باقی نماند

چوں مۓ خسرو بہ تمامی رسید
دور مۓ عشق بہ جامی رسید[1]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خسرو کی حیثیت ہر دور میں مسلّم اور ہر بڑے شاعر و ادیب کے نزدیک ان کی شخصیت محبوب رہی ہے، عوام نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، خواص نے ان کو سر پر بٹھایا، صوفیا کے حلقہ میں وہ شمع بزم رہے اور عرفا نے انھیں اپنی محفل کا صدر نشین کیا، شاہوں اور شہزادوں نے انھیں عزیز رکھا —— یہ ان کے دل کی وسعت و کشادگی، نگاہ کی بلندی،

---

[1] امیر خسرو دہلوی : ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا۔

سخن کی دلنوازی اور جاں کی پُرسوزی ہے جس نے انھیں اس منصب عالی پر فائز کیا۔

اس موقعہ پر یہ قطعی ممکن نہیں کہ امیر خسرو کی ہمہ گیر شخصیت کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے اور پورے طور پر اس کا احاطہ کیا جائے، یہی بات ان کی ہمہ جہت فنکارانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں کے تعین پر بھی صادق آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں سے چند کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے اور باقی کی طرف اشارے کر دیے جائیں، حق تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فنکارانہ صلاحیتوں کا ہر پہلو مفصل نقد و نظر کا مطالبہ کرتا ہے ـــــــ اس سلسلہ میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کی غزلیں ہیں، لیکن اس سے بھی پہلے کہ ہم ان کی غزلوں کا معیار متعین کریں مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں خسرؔو سے پہلے فارسی غزل گوئی کا اجمالی تجزیہ کر لیا جائے۔

درحقیقت فارسی غزل ہو یا اردو غزل وہ ایک صنف سخن سے زیادہ ایک مزاج ہے۔ انسانی نفسیات کا ایک اہم رخ ہے، ایک ایسا طرز فکر ہے جو جذبہ کا تابع ہوتا ہے اور احساس کی ایسی رو ہے جو از خود پابند نغمۂ و صوت ہو جاتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غزل روح کی زبان اور آواز ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارسی اور اردو کی بیشتر متصوفانہ شاعری غزل اور صرف غزل پر مشتمل ہے، غزل کا شاعر عملاً صوفی نہ ہو، اُن مراحل سے نہ گزرے، ان ریاضتوں کا لذت آشنا نہ ہو، روحانی تجربات کی پر پیچ راہوں سے اس کے پائے طلب آشنا نہ ہوں لیکن اپنے مزاج اور اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے وہ بھی صوفی ہوتا ہے، اس پر بھی کشف ہوتے ہیں، روحانی کرب و اذیت کی شیرینی یا تلخی سے وہ بھی بہرہ اندوز ہوتا ہے، آلام ہجر سے وہ بھی دوچار ہوتا ہے اور وصال کی نشاط آفرینیاں اس کو بھی مسرور و شادماں کرتی ہیں۔ غزل ایک طرح کی شیفتگی، از خود رفتگی، ربودگی، دل گرفتگی، آشفتگی، دیوانگی، ژولیدہ مزاجی، آزادہ روی اور قلندری چاہتی ہے۔ غزل میں جن مشاہدات اور تجربات کو سمویا جاتا ہے وہ اکثر عقل کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ ہر شخص ان سے لذت یاب ہو، یہی سبب ہے کہ غزل پر ناہمواری، ابہام اور ژولیدہ خیالی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اصل میں غزل اپنے اظہار کے لیے جو زبان اختیار کرتی ہے وہ قصیدہ و مثنوی کی زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ جو پیکر (IMAGE) تراشتی ہے، جو علامتیں (SYMBOLS) وضع کرتی ہے جن استعاروں (TIETAPHORS) سے کام لیتی ہے اور جو پیرایۂ بیان اختیار کرتی ہے ان کا مقصد شعور کی تہوں کو متحرک، اندروں کی

گہرائیوں کو متاثر، احساس کے تاروں کو مرتعش اور وجدان کے گوشوں کو روشن کرنا ہوتا ہے، عقل ان کے ادراک سے قاصر ہوتی ہے، منطق اپنے صُغرا و کُبرا کا نفاذ ان پر نہیں کر سکتی اور علم کی حجتیں ان کے سامنے اپنی قوتیں کھو دیتی ہیں۔ فارسی میں مولویِ معنوی کی غزلیں، غزل کے اس پہلو کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہیں۔

بظاہر غزل کا ہر شعر جدا اور باہمی ربط سے عاری ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی غزل میں مختلف اور متعدد موضوعات کو چھیڑا گیا ہے لیکن یہ غزل کا نقص نہیں بلکہ خوبی ہے، قصیدہ اور مثنوی کسی مضمون کو بیان کرنے کے لیے تفصیل کے محتاج ہوتے ہیں اور غزل کا حسن اس کے جمال میں ہے، وہ کوزے میں دریا کو بند کر دیتی ہے اور صرف مصرعوں سے عبارتوں کا کام لیتی ہے، یہی سبب ہے کہ غزل کے ہزاروں مصرعے ارسال المثل کی حیثیت اختیار کر کے خواص و عوام کی زبانوں پر جاری ہو جاتے ہیں، اسی سے غزل گو شاعر کی دشواریوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، انسانی جذبات کا سمیٹنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اطناب آسان ہوتا ہے لیکن ایجاز و اختصار مشکل۔

غزل کی اس ناہمواری کا سبب سیاسی بھی ہے۔ فارسی غزل کی تاریخ ترویج و ارتقا سعدی سے باقاعدہ شروع ہوتی ہے، اس سے پہلے قصیدہ اپنے نقطۂ عروج پر تھا اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کا دامن امارت و فارغ البالی، معاشی خوشحالی، ذہنی آسودگی و طمانیت اور معاشرتی سکون و آسائش سے بندھا ہوا ہے، منگولوں کے ہاتھوں ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے نہایت ہی المناک اور عبرت انگیز حادثے نے عشرت و آسائش کی ہر بساط الٹ دی۔ سعدی نے وہ دلدوز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسی تباہی و بربادی اور عظیم تاخت و تاراج کو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر زوالِ ملکِ مستعصم، امیر المومنیں

اب نہ شہنشاہ تھے نہ شاہ، نہ دربار تھے نہ دربارداری، نہ قصر تھے نہ ایوان اور نہ شاعر تھے نہ شاعری، ہر طرف ایک نامسعود سکوت تھا، قصیدے کی بلند آہنگیاں پست ہو چکی تھیں، تخیل کی پرفشانیوں کی فضائیں محدود و تنگ ہو چکی تھیں، فکری تسلسل ختم ہو چکا تھا، اندیشہ و خیال کی باضابطگی ساتھ چھوڑ چکی تھی اور اس دور کا انسان ایک طرح کے ذہنی و فکری مزاج میں مبتلا ہو چکا تھا ——— قصیدے کے لیے یہ آب و ہوا کس قدر مہلک تھی اور اس نے اپنا

کام کر دکھایا لیکن انسانی جذبات و خیالات تو بہر حال اپنا اظہار چاہتے تھے، اب ان میں ایک تیکھا پن پیدا ہو گیا تھا اور ان میں دھار آ گئی تھی، شاعر نے غزل کے دامن میں پناہ لی جہاں وہ “سرِ دلبراں” کو “حدیثِ دیگراں” میں بیان کر سکے، چنانچہ وہی ناآسودگی، وہی دل کی نامحکمی، وہی دنیا کی بے ثباتی، محبوب کے مظالم کے وہی شکوے، وہی یاس و نومیدی، وہی ہجر کے گلے، وہی وصل کا اصرار اور وہی دنیا سے فرارِ غزل کے محبوب موضوعات بن گئے اور اس اعتبار سے حافظ کی غزلیں نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔

اگرچہ اس برصغیر کو منگولوں کی غارت گرانہ تاخت و تاراج کا تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن غزل کو ایک روایت کے طور پر جوں کا توں قبول کر لیا گیا اور وہی موضوعات کچھ ترمیم اور اضافے کے ساتھ یہاں بھی برتے جانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنفِ سخن کو کم قبولِ عام نہیں حاصل ہوا اور متعدد قابلِ فخر غزل گو شعرا نے آنے والی صدیوں میں بزمِ شعر و سخن کو اپنی غزلوں سے گرمایا اور ان میں سے اکثر ہندوستانی نژاد تھے۔

ہندوستان کی سرزمین پر فارسی شاعری کے قدم غزنویوں کے ساتھ آئے اور لاہور ہی وہ پہلا اور ایسا شہر تھا جس کی فضائیں سب سے پہلے فارسی نغمات سے گونجیں اس سرزمین پر ہمیں سب سے پہلا شاعر مسعود سعد سلمان نظر آتا ہے، اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے عربی اور ہندی میں بھی اشعار کہے لیکن ہم تک اس کے ہندی کلام کا کوئی نمونہ نہیں پہنچا۔

اسی عہد کا دوسرا قابلِ قدر شاعر ابوالفرجِ رونی ہوا ہے۔ وہ بہت دنوں تک لاہور میں رہا۔ وہ سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی کا ہم عصر تھا اور کہا جاتا ہے کہ جب ایک شاہی فرمان کی رو سے مسعود سعد سلمان کو قید کیا گیا تو ابوالفرجِ رونی بھاگ کر لاہور آ گیا۔ اس کا دیوان ایران میں طبع ہو چکا ہے —— اس دور سے متعلق دوسرے بھی شعرا رہے ہوں گے لیکن ان کے بارے میں ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچی ہیں۔ تصوّف کی مشہور کتاب “کشف المحجوب” کے مصنّف حضرتِ داتا گنج بخش علی ہجویری کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے، ان کے اشعار ان کی نثری تصنیف میں بکھرے ہوئے ہیں، اس طرح وہ ہندوستان میں صوفیانہ شاعری کے بانی کہے جا سکتے

ہیں ـــــــ یہ شعرا کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں تھے بلکہ انھوں نے قصیدے بھی کہے، مثنویاں بھی کہیں، رباعیات اور غزلوں کے میدان میں بھی طالع آزمائی کی۔

محمد غوری کی آمد کے بعد مرکز ثقل منتقل ہو کر لاہور سے دلی پہنچا اور اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی ایشیا کی اسلامی مملکتیں منگولوں کی آندھی کے سامنے لرز رہی تھیں، اور مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ بغداد کے فلک بوس قصور و محلات آن کی آن میں زمیں بوس ہو گئے، مسلمان صوفیا، علما، فقہا، شعرا اور ادبا نے دلی، بدایوں اور اُچہ میں پناہ لی۔ انھیں شعرا میں ایک شاعر شہاب مہمرہ تھا جو ملک الشعرا تسلیم کیا جاتا تھا۔ امیر خسرو نے اپنے درج ذیل شعر میں اسی کا ذکر کیا ہے ؎

در بداؤں مہمرہ سرمست بر خیز دز خواب   گر بر آید غلغل مرغان دہلی زیں نوا

دوسرا مشہور شاعر شمس الدین دبیر تھا جس کو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کی استادی کا شرف حاصل تھا، خسرو اس کا ذکر بھی بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ منقول ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی "ہشت بہشت" اس کو بنظر اصلاح دی تھی لیکن ان تمام شعرا کا کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا، صرف ایک شاعر عمید سنامی کا کلام ملتا ہے۔ اس کا پورا نام اور خطاب "ملک الکلام امیر فخر الدین عمید سنامی" ہے اور اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ پورے ہندستان کا مستوفی الممالک ہو گیا تھا۔

یہ شعرا تو بہر حال وہ تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے درباروں سے وابستہ تھے لیکن کچھ ایسے بھی مردان باصفا تھے جو باقاعدہ شاعر تو نہ تھے لیکن شعر ضرور کہتے تھے۔ یہ امر کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا کوئی دیوان ہے یا نہیں، مشکوک ہے لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ حضرات شعر کہتے تھے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے مرید حضرت قطب جمال ہانسوی شاعر تھے، اسی عہد میں ضیا بخشی بھی تھے، مشہور صوفی بو علی شاہ قلندر پانی پتی امیر خسرو کے ہم عصر تھے اور ان کی مثنوی "منطق الطیر" ایک شاہکار ہے۔

شعر و سخن کی اس بساط پر جو لاہور سے لے کر دلی تک غزنویوں کے عہد سے لے کر خاندانِ غلاماں تک پھیلی ہوئی ہے ان میں جو شعرا بام عروج پر پہنچے ان میں خسرو سرفہرست ہیں۔ انھوں نے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی طبیعت کی جولانی

کے خوب خوب جوہر دکھائے اور غزل کے میدان میں بھی گوئے سبقت لے گئے۔ غزل جو ایران میں سعدیؔ و حافظؔ کے لیے ایک تجربہ کی حیثیت رکھتی تھی ہندوستان میں ایک روایت کی شکل میں درآمد کی گئی لیکن ہمیں خسرو کی غزلوں میں تجربہ اور روایت دونوں کا امتزاج ملتا ہے اور اسی نے ان کو صف اوّل کے ایرانی غزل گو شعرا میں کھڑا کر دیا، انھیں خود بھی اپنی اہمیت کا احساس ہے ؎

شعر خسرو را فرو خوانند مرغان چمن　　　بے دلے کامد بسوئے باغ بے جاں گشت باز

(ترجمہ ، خسرو کے شعر کو باغ کے طیور نے گایا، جو مغموم شخص باغ میں بے جان ہو کر آیا اس کو ازسرِ نو زندگی مل گئی)

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

سخن بشنو مگر از بندہ خسرو　　　جہاں چوں او سخن گوئے نہ دارد

(ترجمہ ، اگر شعر سننا ہے تو اس غریب خسرو سے سنو ، دنیا میں اس جیسا کوئی شاعر نہیں ہے)

ان کی غزل ان تمام اوصاف پر مشتمل ہے جو غزل کو غزل بناتی ہیں اور جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان میں جوش و خروش، سوز و تپش، شدت جذبات ، وصل محبوب کی مسرتیں، ہجر کی کلفتیں، عشق کی حشر انگیزیاں اور ان تجربات سے پیدا شدہ احساسات کی حدّت ــــــ سب کچھ موجود ہے، ان کے پیرو مرشد حضرت سلطان المشائخؒ نے ان سے ایک مرتبہ صفاہانیوں کے طرز پر شعر کہنے کے لیے کہا تھا، اس سے یہی مراد تھی، حضرت سلطان المشائخؒ اکثر ان سے غزل سنانے کی فرمائش کرتے، خسرو حسن کے خارجی مظاہر سے بے خبر نہیں تھے ، خال سیاہ، زلف شبگون، دراز، رخسار لالہ فام ، لب گلرنگ اور مژدہ ہائے تارک فریب ان کو اپنی طرف کھینچتے تھے ؎

چہ خوش است از دو چشمت نظر نیاز کردن　　　مژہ را کشاد دادن، در فتنہ باز کردن

(ترجمہ: کتنا اچھا ہے کہ تو اپنی آنکھوں سے محبت کی نگاہ کرے، اپنی مژگان کو اوپر اٹھائے اور فتنوں کے دروازے کو کھولے)

تنہا غم خود گفتن با یار چہ خوب آید　　　از گاز برآں لبہا آزار چہ خوب آید

(ترجمہ: محبوب سے تنہائی میں اپنا غم بیان کرنا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ تکلیف کتنا لطف دیتی ہے جو اس کے ہونٹوں کو دانت سے کاٹنے سے ہوتی ہے)

سروے چو قامت تو در بوستاں نہ باشد   زیرا کہ بوستاں را سرو رواں نہ باشد

(ترجمہ:۔ باغ میں تیرے قد جیسا کوئی سرو نہیں کیونکہ اس میں کوئی چلتا ہوا سرو نہیں ہے)

دل شد ز دست مارا، با یار ما کہ گوید؟   ویں درد سینۂ ما، پیش دوا کہ گوید؟
من غرق خوں ہمہ شب او خود بخواب مستی   آنجا کہ اوست، از من ایں ماجرا کہ گوید؟

(ترجمہ: ہمارا دل ہاتھوں سے نکل گیا، یہ بات ہمارے محبوب سے کون کہے اور ہمارے سینہ کے درد کو دوا کے سامنے کون بیان کرے۔

میں رات بھر خون میں ڈوبا رہتا ہوں اور وہ خواب میں مست، جہاں وہ ہے وہاں میرا حال کون بیان کرے۔)

حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں باقاعدہ داخل ہونے سے قبل بھی وہ غزلیں کہتے تھے۔ اس وقت کی بھی جو غزلیں ہیں وہ سوز و دردمندی، حسن کے شعور اور عشق کی حشر انگیزیوں سے خالی نہیں، ان میں کمال اسماعیل اصفہانی سے زیادہ سعدی کا رنگ نمایاں ہے لیکن حضرت سلطان المشائخ کی نگاہ کیمیا اثر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، ان کے ذوق جمال کی پرورش ہوئی، ان کی لذّت چشم و گوش کی تربیت ہوئی اور انھیں ترک دنیا نہیں بلکہ ترک حرص و آز کا درس ملا اور ان کے ذوق قلندری نے نئی منزلیں سر کیں، اس سلسلہ میں ان کے چند ایسے اشعار کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہو گا ؎

وقتست ایں خرابہ بہ دیواں رہا کنیم   پرواز چوں فرشتہ باوج سما کنیم
اے صوفیان مست، یکے رقص عاشقاں   تا ایں کبود کہنہ، بساط شما کنیم
مردانہ وار بازیٔ لا را کنیم باز   دریائے چرخ تا بہ کراں آشنا کنیم
خورشید وار چرخ زناں بر سما رویم   آخر نہ ذرّہ ایم کہ رقص از ہوا کنیم
دولت کمند ساخت ز سر رشتۂ نیاز   تا کنگرۂ حصار فلک زیر پا کنیم
از دست شوق دامن عصمت کنیم چاک   وا انزا در آفتاب قیامت نوا کنیم
بیدار شو دلا کہ نہ خوابست رسم عشق   جز تکیۂ کہ بر کرم مصطفیٰ کنیم

دین محمدیؐ کہ بحق رہنمائے تست
از جان و دل متابعت رہنما کنیم[1]

(ترجمہ :- وہ وقت آگیا ہے کہ یہ خرابہ ہم دیووں کو بخش دیں اور فرشتوں کی طرح آسمان کی بلندی پر اڑیں۔

اے بے خود صوفیو! عاشقوں جیسا ایک رقص کرو تاکہ ہم اس پرانے نیلے آسمان کو تمھارا فرش بنادیں۔

نفی کے کھیل کو بہادری کے ساتھ شروع کریں اور آسمان کے اس سمندر کو اس کا حل بتادیں۔

سورج کی طرح گردش کرتے ہوئے ہم آسمان پر جائیں۔ بہر حال ہم ذرہ نہیں ہیں کہ ہمارا رقص ہوا کے رحم وکرم پر ہو۔

دولت نے عشق کے رشتہ سے کمند بنائی ہے تاکہ اس آسمان کے قلعہ کے کنگرہ کو ہم اپنے پیروں تلے روندیں۔

اپنے عشق کے ہاتھ سے عصمت کے دامن کو چاک کریں اور قیامت کی دھوپ میں اس کا پرچم بنائیں۔

اے دل جاگ جاکہ عشق خواب نہیں، عشق سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کرم پر بھروسہ کریں۔

دین محمدیؐ (اسلام) خدا تک تیری رہنمائی کرنے والا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم جان و دل سے اپنے مرشد کی پیروی کریں)

منقول ہے کہ ایک صبح حضرت سلطان المشائخؒ اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے تو رات بھر کی عبادت و ریاضت کی وجہ سے آپ پر ایک خمار کی سی کیفیت طاری تھی اور آپ کی آنکھیں سرخ تھیں، اس وقت خسرو موجود تھے، انھوں نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب   کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

---

[1] عزۃ الکمال : امیر خسرو بحوالہ امیر خسرو دہلوی : ممتاز حسین۔

(تم مخمور معلوم ہوتے ہو، تم رات بھر کس کے ساتھ جاگتے رہے ہو کہ اب تک تمھاری آنکھوں میں خمار باقی ہے ؟)

امیر خسرو کا میلان شروع ہی سے تصوف کی طرف تھا، چنانچہ ان کے دیوان "تحفۃ الصغر" میں ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن کی فضا متصوفانہ ہے، یہ اثرات ان کے ہاں سید حسن غزنوی اور سعدی کے مطالعہ سے آئے تھے لیکن ان کے ان خیالات و تصورات پر جلا حضرت سلطان المشائخ کے فیض صحبت سے ہوئی جن سے ان کے تعلقات کا آغاز غیاث الدین بلبن ہی کے دور حکومت سے ہو چکا تھا لیکن استواری و پختگی سلطان جلال الدین خلجی کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر ہم ان کی پوری شاعری پر اس رجحان کو غالب پاتے ہیں۔ اب زلف و رخسار کے معنی بدل گئے، کفر و اسلام کا مفہوم دوسرا ہو گیا، سبو و ساغر و مے کا استعمال دوسرے پس منظر میں ہونے لگا، چشم و ابرو سے کچھ اور مراد لیا جانے لگا اور رند و فقیہہ نے دوسرا لباس پہن لیا۔ الغرض یہ کہ انھوں نے اپنی غزلوں کو ایک دیر پا مفہوم و معنی سے آشنا کیا اور اسی محور کے گرد گھومتے رہے جس کو مخلوق خدا سے محبت کرنا کہتے ہیں، چند اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

ما و عشق یار ، اگر در قبلہ، گر در بتکدہ   عاشقان دوست را با کفر و ایماں کار نیست
عاشقی ام کہ گر آواز دہی جان مرا   دوست از سینہ ام آواز بر آرد کہ منم
چوں جمالت آیت رحمت شد اندر شان خلق   آخر ایں چندیں زہر کشتنم تاویل چیست
چہ پوشی پردہ بر روئے کہ آں پنہاں نمی ماند   وگر بے پردہ می داری تنے را جاں نمی ماند
گوکہ چند شوی بے خبر ز مستیٔ عشق   کسے کہ مستیش از عشق نیست بے خبر است
ضائع آں وقتے کہ بر زندہ دلاں بے عشق رفت   ناخوش آں روزے کہ بر مستاں بہ ہشیاری گذشت
یک قدم بر جان خود نہ، یک قدم در کوئے دوست   زیں نکوتر رہروان عشق را رفتار نیست
عاشقے را کہ غم دوست بہ از جاں نہ بود   عاشق خود بود و عاشق جاناں نہ بود
اے اہل دل نخست ز جاں ترک جاں کنید   وانگہ نظارہ در رخ آں دلستاں کنید
ہر کہ بر حال عاشقاں خندید   گریہ ای واجب است بر جانش
بجرم عشق اگر کافر کنندم خلق، گو می کن   مرا باری زباں ہرگز بہ استغفار نکشاید
عشق اگرچہ نشان بخت بد است   نزد عاشق سعادت ابد است

(ترجمہ: ہم ہیں اور محبوب کا عشق ہے، چاہے کعبہ ہو چاہے بت خانہ، محبوب کے عاشقوں کو کفر اور ایمان سے کوئی کام نہیں۔

میں عاشق ہوں، اگر تو میری جان کو پکارے تو دوست میرے سینہ سے جواب دے گا کہ میں ہوں۔

جب تیرا حسن خلق کے لیے رحمت کی نشانی ہے تو میرے قتل کرنے میں اتنی بحث و تکرار کیوں ہے؟

تو اپنے چہرہ پر نقاب کیا ڈالتا ہے، وہ مستور نہیں رہ سکتا اور اگر تو بے نقاب ہو جائے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔

یہ تو بتا کہ تو عشق کی مستی سے کیوں بے خبر ہے، وہی شخص بے خبر ہے جو عشق کی مستی سے ناواقف ہے

زندہ دلوں پر وہ وقت ضائع ہوا جو بغیر عشق کے گزرا، مستوں کے لیے وہ دن منحوس رہا جو ہوشیاری میں بیتا۔

ایک قدم تو اپنی جان پر رکھ اور ایک قدم محبوب کے کوچے میں، عشق کے رہرووں کے لیے اس سے بہتر کوئی رفتار نہیں۔

وہ عاشق جس کے نزدیک محبوب کا غم جان سے بہتر نہ ہو وہ اپنا عاشق ہوتا ہے محبوب کا نہیں۔

اے دل والو! پہلے تو خلوص سے جان کو ترک کرو، پھر اس وقت محبوب کے چہرہ کا نظارہ کرو۔

جو شخص عاشقوں کے حال پر ہنسا اس کے حال پر رونا ضروری ہے۔

اگر عشق کے جرم میں دنیا مجھے کافر کہتی ہے تو اس سے کہو کہتی رہے، میں ایک بار بھی اس سے توبہ کرنے کے لیے زبان نہ کھولوں گا۔

اگرچہ عشق بظاہر بدبختی کی علامت ہے لیکن عاشقوں کے نزدیک یہ دائمی خوش قسمتی ہے۔

مندرجہ بالا اشعار میں خسرو نے جس عشق اور جس محبوب کا ذکر کیا ہے وہ، یقیناً عام مفہوم سے بالاتر ہے، یہ وہ عشق ہے جس کا سلسلہ اس عالمگیر محبت سے مل جاتا ہے جو خلق اللہ کی محبت سے عبارت

ہوتی ہے اور جس میں دشمن بھی دشمن نہیں رہ جاتا، دوست تو پھر دوست ہی ہے، تصوف و معرفت الٰہی کی منزل میں یہی وہ بنیادی نقطۂ انشعاب ہے جس سے اس شجر نور کی شاخیں پھوٹتی ہیں جن کے خنک سائے میں تھکے ہارے، شکستہ و خستہ انسانی قافلے آسودہ اور بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

امیر خسرو نے یوں تو قصائد بھی لکھے، مثنویاں بھی لکھیں اور دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن غالباً یہ سب کچھ دوسروں کے لیے تھا اور خود ان کے لیے وسیلۂ حیات، لیکن اپنے لیے انھوں نے صرف غزلیں کہیں جو ان کے مافی الضمیر کی آئینہ دار ہیں اور جن میں ان کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے، اسی لیے اگر انھیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے آنے والی نسل کے لیے اس برصغیر میں فارسی غزل گوئی کا ایک انداز اور اسلوب متعین کر دیا۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت و جدت، زبان و بیان کا حسن و اثر انگیزی، محاورات اور بندشوں کی دل آویزی، جذبہ و خیال کی نزاکت و لطافت، لہجہ کی نظافت و شستگی اور ابلاغ و اظہار کی سادگی و متانت، غزلیات خسرو کی ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جنھوں نے ان کو فارسی شاعری کے سبک ہندی کا پایہ گزار اور بانی بنا دیا ہے۔

معنی آفرینی پیچیدگی، دقّت خیال، تصنع، آورد، پرواز تخیل، دور از کار معانی و مفاہیم، ندرتِ بیان اور فلسفیانہ انداز بیان کو سبک ہندی کی خصوصیات قرار دیا گیا ہے، مبالغہ، اغراق، غلو اور دوسرے صنائع و بدائع کے استعمال کو کلام کی بلندی و خوبی کا معیار گردانا گیا[1]۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظم و نثر دونوں ہی ان زنجیروں سے گرانبار ہیں۔ مثنویات و قصائد بالخصوص ان سے متاثر ہوئے اور بیشتر ہندوستانی فارسی شعرا کی فنی اور شعری کاوشوں کا رخ اسی جانب رہا۔ نتیجہ کے طور پر ادب، ادب نہ رہا۔ شعر، شعر نہ رہا بلکہ ایک چیستاں اور معمّہ بن گیا، وہ چیز جسے سادگی و پرکاری کہا گیا ہے، نام کو بھی نہ رہی، خوبی صرف کرشمہ و ناز و خرام تک محدود ہو کر رہ گئی اور وہ شیوہ ہائے بے نام جن سے عظیم ادب وجود میں آتا ہے عنقا ہو گئے۔

خسرو کے قصائد و مثنویات اور نثری مجموعے ان تکلفات سے پر ہیں لیکن اس وقت ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خسرو جب دوسری اصناف نظم و نثر پر قلم اٹھاتے ہیں تو ایک جلال اور طنطنہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن جب وہ غزل کے حضور میں آتے ہیں تو

---

[1] امیر خسرو اور سبک ہندی: پروفیسر امیر حسن عابدی، مشمولہ "خسرو شناسی" مرتبہ ظ۔ انصاری، ابوالفیض سحر۔

سراپا عجز و انکسار بن جاتے ہیں، ان کی پیشانی پر غبار مسکنت ہوتا ہے، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں، ان کے ہونٹوں پر ایک لرزش خفی ہوتی ہے اور ان کے پورے وجود پر ایک خمار، ایک سرمستی، ایک شیفتگی اور از خود رفتگی و ربودگی کی کیفیت طاری رہتی ہے، وہ اپنی غزلوں میں معاملات حسن و عشق کی باتیں کرتے ہیں، زلف و خال کا ذکر کرتے ہیں، دہان و لب کے افسانے بیان کرتے ہیں، تصوف و معرفت کے دقائق و غوامض کی چہرہ کشائی کرتے ہیں، فلسفہ و فکر کی نکتہ شناسی میں مصروف ہوتے ہیں اور کائنات اور اسرار کائنات کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، لیکن کہیں بھی غزل کی لطافت و سادگی مجروح نہیں ہونے پاتی۔ سبک ہندی کے بانی ہونے کی حیثیت سے ان کی غزلوں میں بھی ژولیدگی، پیچیدگی اور اغلاق ہونا چاہیے تھا لیکن خسرو کی غزلیں اس عیب سے پاک ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار دل کو چھوتے ہیں اور ان کی رسائی براہ راست روح کی گہرائیوں تک ہوتی ہے، درج ذیل غزل کا حسن، موسیقی، ترصیع و زیبائش اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بلا کی سادگی ملاحظہ ہو:

کج کلہا، ستمگرا، تنگ قبائے کیستی   لابہ گرابی دلبرا، عشوہ نمائے کیستی
زیر کلاہ، جعد تر، تا کمرت کشیدہ سر   بستہ بجا بکی کمر، چست قبائے کیستی
ہر کب ناز کردہ زیں، دادہ بغمزہ تیغ کیں   ساختہ آمدہ چنیں، ناز برائے کیستی
سینہ بندہ جائے تو، دیدہ بزیر پائے تو   ما ہمہ در ہوائے تو، تو بہوائے کیستی
تا رخ خود نمودہ، جان و تنم ربودہ   آتش من فزودہ، مہر فزائے کیستی

خسرو خستہ را سخن بستہ شد از تو در دہن
طوطی شکرین من، نغمہ سرائے کیستی

خسرو نے اپنی غزلوں کے پانچ دیوان یادگار چھوڑے ہیں یعنی تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال۔ اول الذکر چار دیوان کہ تشبیہ انھوں نے عناصر اربعہ سے دی ہے یعنی خاک، آب، باد اور آتش —— ان کے پہلے دیوان کی غزلیں خاک کی طرح سرد، خشک، کثیف اور کمزور ہیں۔ صنائع و بدائع کے اعتبار سے بھی . . . . . . کثافت کی طرف میل رکھتی ہیں —— دوسرے دیوان "وسط الحیات" کی غزلیں ان کے خیال کے مطابق مانند "آب" لطیف اور خاک سے برتر ہیں اور الفاظ کثیف کی کدورت سے پاک ہیں۔ یہ گرم و تر

دونوں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تیسرے دیوان غرۃ الکمال کی حیثیت "باد" کی ہے۔ اس دیوان کی غزلیں لطیف ترا رواں ترا ور برتر ہیں، از بس لطافت کی وجہ سے ان میں کوئی خلل راہ نہیں پاتا، یہ غزلیں ہوا کی مانند گرم وتر اور پانی کی طرح لطیف و رواں تر ہیں اور انھوں نے اپنی غذا آتشِ طبع سے حاصل کی ہے۔۔۔۔ ۔۔۔ چوتھے دیوان بقیہ نقیہ کی غزلیں بمنزلہ آتش ہیں کیونکہ آگ بلندی کی جانب میل رکھتی ہے اور کبھی بھی پستی کی طرف رجوع نہیں کرتی اور کوئی طبع بھی اس سے زیادہ بلند نہیں ہوتی اور اس تک نہیں پہنچی اسی لیے حرارت جو آگ کا خاصہ ہے نرم دلوں پر اس طرح اثر کرتی ہے جیسے روئی میں آگ لگ جاتی ہے، سخت دلوں کو نرم کرتی ہے اور جلا کر راکھ کر دیتی ہے"* لہ

پہلا دیوان "تحفۃ الصغر جو ۶۷۱ھ میں مرتب ہوا اس میں امیر خسرو کی وہ غزلیں شامل ہیں جو آغازِ شاعری سے بیس سال کی عمر تک انھوں نے لکھیں۔ دوسرے دیوان" وسط الحیات" کی ترتیب ۶۸۳ھ میں عمل میں آئی۔ اس میں ان کا بیس سال کی عمر سے لے کر اکتیس سال کی عمر تک کا کلام ہے۔ تیسرا دیوان "غرۃ الکمال" ۶۹۲ھ میں اس وقت مدون ہوا جب امیر خسرو کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ چوتھے دیوان "بقیہ نقیہ" ۷۱۶ھ میں چالیس سال کی عمر سے لے کر ترسٹھ سال کی عمر تک کا کلام ہے اور آخری دیوان "نہایت الکمال" کی تالیف انھوں نے ۷۲۵ھ میں کی اور یہی ان کا سالِ وفات بھی ہے۔ اس میں ان کی عمر کے آخری سات سالوں کا کلام محفوظ ہے ۔ ۱۹۶۳ء میں تہران سے "دیوان کامل امیر خسرو دہلوی" مرتبہ سعید نفیسی شائع ہوا، اس دیوان میں امیر خسرو کی ۱۷۲۶ غزلیں شامل ہیں، اس موضوع کے اختتام پر خسرو کی غزلوں کے مزید اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

نہ بینم آں لب خنداں ز بیم جاں یک رہ ۔۔۔ ز دور سنگ خورم، با گہر چہ کار مرا
بندۂ عشقم و آناں کہ دریں غم مردن ۔۔۔ تا زیم گرد سر تربت شاں خواہم گشت
ملامت گو، برسوائی مترساں ہوشیاراں را ۔۔۔ کہ من بے پا و سر در کوئے او مستانہ خواہم شد
خرم آں روز کہ من آں رخ زیبا بینم ۔۔۔ او کند ناز و من از دور تماشا بینم

---

* دیباچہ دیوان "بقیہ نقیہ": امیر خسرو۔

لہ امیر خسرو نے یہ دیباچہ دیوان "بقیہ نقیہ" کی تکمیل پر اور دیوان "نہایت الکمال" کی تصنیف سے قبل لکھا۔

ہمہ شب خون دل نوشم بیادش   شراب ارغوانی من اینست
فراز مرکب ناز او سوار، در عقبش   ہزار شیفتہ و بے قرار می آید
گلگشت باغ می کند امروز سرو من   بنگر کہ باز بر گل خوشبو چہ می رود؟
چمن ز سبزہ خطے بر رخ جمیل کشید   بباغ سرو رواں قامت طویل کشید
قیمت گل نہ شناسد مگر آں مرغ اسیر   کہ خزاں دیدہ بود، پس بہ بہارے برسد
نیست رنجے گر تن از غم مو شد و رنج ست و بس   کاں ز تار موئے خوباں یادگارے داشتم

یوں تو فارسی مثنوی نگاری کے میدان میں فردوسی اور مولانا نظامی گنجوی کو شہرت دوام حاصل ہو چکی ہے اور آج بھی ہم ان کا نام عزّت و احترام سے لیتے ہیں لیکن امیر خسرو نے اگر ایک طرف غزل کے دامن کو وسیع کیا تو دوسری طرف مثنوی کی نشاۃ الثانیہ بھی ان کی ممنون ہے۔ ان کی مثنویوں کا مطالعہ اس حقیقت کو پورے طور پر واضح کرتا ہے۔ ان کی مثنویوں کا وہ سلسلہ جو "خمسہ" یا "پنج گنج" کے نام سے منسوب ہے اس سمت ایک دلیرانہ اقدام ہے اور یہ قدم خسرو ہی جیسے قد و قامت کا انسان اور شاعر اٹھا سکتا تھا۔ نظامی جیسا باکمال شاعر سارے مواد کا استعمال کر چکا تھا، اب خسرو کو اپنا خوان نعمت ان چیزوں سے سجانا تھا جو بچ رہی تھیں، یہ تو کہنا مناسب نہ ہوگا کہ انھوں نے مولانا نظامی کا جواب دیا کیونکہ وہ خود ان کی استادی اور عظمت کے معترف ہیں ؎

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر   وز دُر او سر بسر آفاق پُر
پختہ از و شد چو معانی تمام   خام بود پختن سودائے خام[1]

ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں ؎

زندہ است بمعنی اوستادم   ور نیست منش حیات دادم[2]

اس وقت یہ تو ممکن نہیں کہ امیر خسرو کی ہر مثنوی پر تفصیلی بحث کی جائے اور ان کے محاسن پر گفتگو ہو، سر دست ان کی مثنویوں کے اجمالی تعارف پر اکتفا کی جاتی ہے۔ تاریخ تصنیف کے اعتبار

---

[1] امیر خسرو : قران السعدین۔

[2] امیر خسرو : لیلیٰ مجنوں۔

سے ان کی سب سے پہلی مثنوی "قران السعدین" ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف ۶۸۸ھ ہے اور اس میں ایک تاریخی واقعہ کو نظم کیا گیا ہے، جس کا ذکر پچھلے کسی باب میں ہو چکا ہے۔ اس مثنوی میں اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار نو سو چوالیس ہے اور چھ ماہ کی مختصر مدت میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی انھوں نے سلطان معز الدین کیقباد کی فرمائش پر لکھی تھی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موت نے سلطان کو اس بات کا موقعہ نہیں دیا کہ وہ اس مثنوی کو دیکھتا۔ اس مثنوی کا نام "مثنوی در تعریف دہلی" بھی ہے[1]
امیر خسرو نے خود اس مثنوی کے اشعار کی تعداد اس شعر میں بتائی ہے ؎

نُہ صد و چار و چہل و سہ ہزار
ور زعمل بازکشائی شمار

"قران السعدین" کی تصنیف کے بعد انھوں نے ۶۹۰ھ میں دوسری تاریخی مثنوی "مفتاح الفتوح" یا "تاج الفتوح" یا "فتح الفتوح" یا "فتحنامہ" کو نظم کرنا شروع کیا۔ اس وقت فیروز شاہ جلال الدین خلجی تخت سلطنت پر متمکن ہو چکا تھا اور اس میں اس کی حکومت کے پہلے سال کے حالات درج ہیں۔ اس مثنوی میں "قران السعدین" کے مقابلہ میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے اسی لیے انھوں نے اس مثنوی کو اپنے تیسرے دیوان "غرۃ الکمال" میں شامل کیا اور اس کو دوسری مثنویات کی طرح علاحدہ کتابی حیثیت نہیں دی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "مفتاح الفتوح" کی تصنیف کے بعد سات سال تک امیر خسرو نے مثنوی کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ۶۹۸ھ میں مثنویوں کا وہ عظیم الشان سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کا نام مولانا نظامی گنجوی کے ساتھ لیا جانے لگا۔ اس زمانہ میں خمسہ نظامی کا جواب لکھنا گویا فارسی شعر و سخن کا اعلا معیار سمجھا جاتا تھا۔ ان میں امیر خسرو اور مولانا عبد الرحمن جامی کے خمسوں کو مولانا نظامی کے بعد شہرت جاوید حاصل ہوئی، پھر بھی امیر خسرو کے خمسے مولانا جامی کے خمسوں سے بہتر شمار کیے جاتے ہیں۔ ان خمسوں کے لکھنے میں تقریباً تین سال کی مدت صرف ہوئی اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد سترہ ہزار نو سو دس ہے۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی مثنوی "مطلع الانوار" ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار تین سو چوبیس ہے اور ۶۹۸ھ میں صرف دو ہفتے کے قلیل عرصہ میں تمام ہوئی۔ امیر خسرو خود کہتے ہیں ؎

---

[1] ترتیب کُلّیاتِ حضرت امیر خسرو : نواب محمد اسحاق خاں، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ شیخ سلیم احمد، ادارۂ ادبیات دلّی۔

از اثر اختر گردوں خرام شد بہ دو ہفت ایں مہ کامل تمام

اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بھی امیر خسرو ہی کا قول ہے ؎

سال کہ از چرخ کہن گشت بود از پس شش صد نو دو ہشت بود

اس میں نہ تو کوئی داستان نظم کی گئی ہے اور نہ حکایت، اس کا تعلق اخلاقی اور صوفیانہ موضوعات سے ہے، اس میں علما کو اپنے منصب و فرائض سے آگاہ کیا گیا ہے۔ انھیں تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے قلم کو آلۂ تزویر نہ بنائیں اور تیغ نبی کو شیطان کے ہاتھ میں نہ دیں۔ خسرو نے ان ظاہر پرست علما کی بھی نشاندہی کی ہے جو بادشاہ کی خوشنودیِ مزاج کی خاطر اس کی ہرزہ گوئی کو بھی امام ابو حنیفہؒ کے قول کا مرتبہ دیتے ہیں، فن بوجہل پر متفق ہو جاتے ہیں اور عدل عمرؓ کو نفاق کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے علم بے عمل کی ذلت بھی بیان کی ہے، ابنائے زمانہ کی شکایت بھی کی ہے اور ان صوفیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو پشمینہ پوش تو ہوتے ہیں لیکن ان کے کانوں میں اذان کی آواز نہیں پہنچتی۔ الغرض یہ وہ شیخ ہیں جن کے ہاتھوں میں سونے کے بت ہوتے ہیں، وہ "پدرم سلطان بود" کے اصول پر یقین نہیں رکھتے، سوال یہ ہے کہ خود تمھارے اندر کیا جوہر ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے تربیت اولاد کے موضوع پر بھی توجہ دی ہے۔ ان کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے کیوں کہ صدف سادہ کے بغیر موتی نہیں پیدا ہو سکتا۔

اس مثنوی میں، ہمیں مختلف مناظر دکھائی دیتے ہیں، اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو کو مناظر فطرت کے بیان کرنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔ مثلاً: وہ رات، طلوع سحر، موسم بہار اور خزاں وغیرہ کی نہایت کامیاب منظر کشی کرتے ہیں

"شیرین خسرو" جو اس سلسلہ کی اور ترتیب کے اعتبار سے بھی دوسری مثنوی ہے ایک نیم تاریخی قصہ پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کے نام، تعداد اشعار اور تاریخ تصنیف کے بارے میں خود امیر خسرو کے اقوال یہ ہیں ؎

پس از کلکم چکید آں شربت نو کہ نامش کردہ شد شیرین و خسرو

در آغاز رجب شد فرخ ایں فال ز ہجرت شش صد و ہشت و نود ۶۹۸ سال

۴۱۲۴

دگر پرسی کہ بیتش را عدد چیست　　　چہار الف و چہار است و صد و بیست

خسرو نے پورے طور پر رزم و بزم اور حسن و عشق کے تذکرہ کا حق ادا کیا ہے۔ اس میں ہمیں فلسفیانہ اسرار و حِکَم بھی ملتے ہیں، متکلمانہ اور حکیمانہ نتائج بھی نظر آتے ہیں، دنیا کی بے ثباتی، انقلاب زمانہ، آداب معاشرت اور تربیت و اصلاح کے موضوعات بھی ہیں اور انسانی جذبات کی عکاسی و مناظرِ قدرت کی تصویر کشی بھی، سوز و گداز اور تصوف و معرفت کے رموز بھی۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے اس امر کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ امیر خسرو کو انسانی جذبات کے اظہار پر کتنی قدرت حاصل ہے انھوں نے صنائع و بدائع کا استعمال بھی بڑی چابک دستی سے کیا ہے، ہمیں جا بجا ایہام، مراعات النظیر، حسن تعلیل مبالغہ اور وصل الحرفین کی مثالیں ملتی ہیں۔

> "۔۔۔۔۔ امیر خسرو کی سخن طرازی کا اعجاز یہ ہے کہ آپ نے ایک المیہ ڈراما کو اپنی جدت پسند طبیعت کی پر زور قوت کے اثر سے ایسا اخلاقی پند نامہ اور ادبی گنجینہ بنا دیا ہے کہ اول سے آخر تک ہر داستان کے ضمن میں دنیا کی بے ثباتی، زمانہ کا انقلاب، حکیمانہ نصائح، صوفیانہ مواعظ، متکلمانہ مباحث، شراب کے نقائص، ہوا و ہوس کی تنقیص، حکمرانی کے اصول، معاشرت کے قواعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عدل و داد کے خصائل، جور و جفا کے قبائح، عبادت الٰہی کی تاکید، مذہب کی ضرورت، اسلام کی خوبیاں وغیرہ وغیرہ جلوہ آرا ہیں [1]"

خمسۂ خسرو کی تیسری مثنوی "مجنوں لیلیٰ" ہے اس کی بھی تاریخ تصنیف ۶۹۸ھ ہے۔ اس سن میں انھوں نے تین مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو اور مجنوں لیلیٰ لکھیں، ان کے اشعار کی مجموعی تعداد دس ہزار بیالیس ہے۔ مولانا نظامی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ہے۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی کا نام "مجنوں لیلیٰ" رکھا جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

نامش کر زغیب شد مسجل　　　مجنوں لیلیٰ، بعکس اول

اس میں دو ہزار چھ سو ساٹھ اشعار ہیں ؎

بیتش بہ شمار راستی ہست　　　بلہ دو ہزار و شش صد و شست

---

[1] شیریں خسرو: مولوی علی احمد خاں اسیر قادری بدایونی، مشمولہ امیر خسرو: "احوال و آثار" مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری۔

مگر تم تک جو نسخہ پہنچا ہے اس میں اشعار کی تعداد دو ہزار چھ سو آٹھ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ باون اشعار دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

یہ عشق و محبت کی وہی المناک داستان ہے جو ناکامی و نامرادی اور تباہی و بربادی پر منتج ہوتی ہے اور جو ہر شخص کے علم میں ہے۔ اگرچہ اس کی تاریخی حیثیت مشکوک اور پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہے لیکن عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں اس کو جو شہرت عام اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم ہی کسی داستان کو حاصل ہوئی ہوگی۔ اس داستان کو مولانا نظامی نے منظوم کیا۔ امیر خسرو کب اس سے تغافل برت سکتے تھے، انھوں نے بھی اس میدان میں اپنی فکر و طبع کو جولاں کیا۔ عشق کی بوقلمونی ہجر کا کرب، وصل و دید کی تمنا، نالہ و زاری، آہ و بکا، گریہ و شیون، صحرا نوردی و بیاباں گردی، از خود رفتگی و وحشت، دیوانگی و چاک دامانی، ابنائے زمانہ کی بے مہری، محرومی و یاس اور پھر ایک المناک اور دل گداز خاتمہ، خسرو نے ان تمام احوال و کوائف کی تصویر کشی کی ہے اور اپنی قدرت سخن اور تخیل کی بلندی کے کمال دکھائے ہیں خواہ وہ لیلیٰ کے حسن کا اظہار ہو یا بہار و خزاں کا نقشہ کسی واقعہ کا بیان ہو یا الجھے ہوئے جذبات کی ترجمانی —— امیر خسرو ہر مقام سے آسان گذر جاتے ہیں۔ انھوں نے حقائق و معارف کا بھی ذکر کیا ہے اگرچہ اس عشقیہ داستان میں ان کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں لیکن خسرو کے ذہن رسا نے ان کے اظہار کی راہ تلاش کر لی، علم کی اہمیت، اس کا معیار، آسودگی کا راز، ہمت کے وسیلے سے شرف و بزرگواری کا حصول، بے اصولی کی مذمت اور سعی مسلسل —— ایسے موضوعات ہیں جن پر خسرو نے اس مثنوی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"آئینۂ سکندری" مولانا نظامی کی مثنوی "سکندر نامہ" کی تقلید میں لکھی ہوئی خمسۂ خسرو کی چوتھی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی خسرو کے قول کے مطابق چار ہزار چار سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے ؎

گر آری ہمہ بیتش اندر عدد   چہار الف و پنجہ شد و چار صد

مگر ہم تک جو نسخہ پہنچا ہے اس میں چار ہزار چار سو گیارہ شعر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انتالیس شعر دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ یہ مثنوی انھوں نے ۶۹۹ھ میں لکھی۔

امیر خسرو کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ سکندر کی شخصیت اور فتوحات اور تاخت و تاراج کے کس پہلو پر قلم اٹھائیں کیونکہ مولانا نظامی "سکندر نامہ" میں سارے اہم پہلوؤں کو نظم کر چکے تھے۔ خسرو کے لیے یہ بڑا مشکل کام تھا جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ہنر پرور گنجہ کی نظر جب اس جام صہبا پر پڑی تو اس نے صاف تو لے لیا اور دُرد میرے لیے چھوڑ دیا۔ اب ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ رہا کہ وہ پس خوردۂ نظامی ہی پر اکتفا کریں اور اسی میں اپنی جولانی طبع اور کمال فن کے جوہر دکھائیں۔ مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خسرو کی جدت پسند طبیعت نے ایسے گوشے تلاش کر لیے جن میں ان کے متخیلہ کی بوقلمونی رنگ لا کر رہی اور نتیجہ کے طور پر یہ مثنوی بھی اس منزل پر پہنچ گئی کہ "سکندر نامہ" کے بالمقابل رکھی جا سکے۔

حمد باری تعالیٰ، نعت سید المرسلین علیہ افضل التحیات، معراج کے واقعہ کا ذکر، بادشاہ کی مدح، رزم، صبح کی منظر کشی، شام کا سماں، واقعہ نگاری، بزم اور مناظر کی صورت گری ــــــ الغرض ہر موضوع پر خسرو نے قلم اٹھایا ہے۔ یہ مثنوی بظاہر رزم و بزم کی جولانگاہ ہے لیکن اس میں ہمیں پند و نصائح بھی ملتے ہیں، وہ روزی کمانے، ہنر سیکھنے، مذہب کی پابندی، صدق و راست بازی اختیار کرنے کی ترغیب و تشویق کرتے ہیں، انھوں نے دنیا پرست اور حریص علما کو یہاں بھی نہیں بخشا، اس میں ہمیں ہندوستانی رسوم و تشبیہات بھی نظر آتی ہیں۔

خمسہ کی پانچویں اور آخری مثنوی "ہشت بہشت" ہے جو ۷۰۱ھ میں تصنیف ہوئی۔ خسرو نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد تین ہزار تین سو پچاس بتائی ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

ہمہ بیتش بگاہ عرض شمار   سہ صد و پنج آمد و سہ ہزار
سال ہجری یکے و ہفصد بود   کیں بنا بر دسر بچرخ کبود

اس مثنوی میں بہرام گور کے تعلق سے سات قصّے بیان کیے گئے جو خسرو کی قوت تخیل کا نتیجہ ہیں۔ یہ قصّے وہ سات شہزادیاں بیان کرتی ہیں جو اس کو سیر و شکار سے باز رکھنے کے لیے اس کے وزیر دانا نے ہفت اقلیم کے بادشاہوں سے استدعا کر کے حاصل کی تھیں۔ یہ تمام قصے اگرچہ فرضی ہیں لیکن انھیں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ واقعی معلوم ہوتے ہیں۔

یہ مثنوی بھی ان تمام خصوصیات سے مملو ہے جو مثنوی کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں اور نکھارتی

ہیں۔ حمد، نعت پیغمبرؐ، اصحاب نبوی کی منقبت، شیخ طریقت کی مدح، سلطان علاؤ الدین خلجی کو نصیحت اپنی لڑکی کو نصیحت اس مثنوی کے خاص موضوعات ہیں۔ بہرام کی شجاعت و بہادری، صبح کا ذکر، شب کا تذکرہ، معشوق کے اوصاف، باغ و صحرا کی تصویر کشی وغیرہ میں خسرو کمال حاصل کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت خسرو کے خلاق ذہن کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ خسرو نے مثنوی کی افادی حیثیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہ قصے صرف تفریح طبع کے طور پر نہیں بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان کا مقصد اعلا اخلاق کا پیدا کرنا ہے، انسان کو بہتر انسان بنانا ہے، خیر کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ ان قصوں میں ایسے بے شمار فوائد مضمر ہیں جن سے معاشرت، اخلاق اور تمدن کی بہتری اور زیبائش کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اگر انسان سوجھ بوجھ اور بصیرت سے کام لے اور تدبر و تفکر کو اپنا رہنما بنالے تو وہ اپنے نفس کی اصلاح کر سکتا ہے عقل کے سرمایہ میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ترقی کی راہ پر انسانی معاشرہ کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ تہذیب کے مطلع کو روشن کر سکتا ہے اور تمدن کے افق میں وسعت پیدا کر سکتا ہے۔

یہ تھا ایک مختصر سا جائزہ اور تعارف خمسۂ خسرو کا —— ایک وقت وہ تھا جب نظامی کی تقلید فارسی ادب کا معیار اعلا قرار پا چکا تھا چنانچہ بہتوں نے ان کی تقلید میں مثنویاں لکھیں، ان جادہ پیماؤں میں امیر خسرو، عبد الرحمٰن جامی، لوائی اور فضولی کو شہرت حاصل ہوئی لیکن ان میں بھی نظامی کے بعد اگر کسی کو مرتبہ کی بلندی حاصل ہوئی تو وہ امیر خسرو ہیں۔ انھوں نے اس "نقد قیمتی" سے تین سال میں اس پنج گنج کو مالا مال کیا اور تقریباً اٹھارہ ہزار اشعار کہہ ڈالے جب کہ خمسۂ نظامی میں اٹھائیس ہزار اشعار ہیں۔ خسرو نے بھی ان مثنویوں میں وہی بحور استعمال کی ہیں جن میں مولانا نظامی کی مثنویاں لکھی گئی ہیں بلکہ اگر ان کی دوسری مثنویوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو انھوں نے دو بحروں کا اور اضافہ کیا۔ الغرض یہ کہ نظامی کے ساتھ ساتھ عظیم شعرا نے خسرو کی عظمت کو بھی قبول کیا ہے، چنانچہ ایران کے ایک مشہور اور ہر دل عزیز شاعر ہاشمی کاشانی یوں نغمہ سرا ہیں ؎

شرح کمالات نظامی کنم   پیروی خسرو و جامی کنم
آں چہ تواں گفت نظامی ربود   باقی آں خسرو و جامی ربود
خواستم از روح نظامی مدد   و ز نفس خسرو و جامی مدد

دوسرے ایرانی شاعر مکتبی شیرازی یوں ترانہ سنج ہیں ؎

ہر چند کہ خسرو ونظامی دادند دو خانہ را تمامی
من کیں نمط یگانہ کردم نقاشی آن دو خانہ کردم
این دُر کہ برشتہ کردم از تو از گنج نظامی است وخسرو

اسی طرح ازبک شاعر "نوائی" ہلالی، جامی عبدؔ وبے اور فضولی بھی امیر خسرو کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ "حضرت امیر خسرو جہاں دیگر اصناف سخن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے وہاں مثنوی میں بھی ان کا پایہ بہت اعلا ہے۔ سادگی وصفائی کے ساتھ ساتھ ایک خاص جوش واثر، دل آویزی و دل ربائی ان کی مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ بیان کی سلاست، زبان کی شوخی، الفاظ کی موزونیت بندش کی نفاست، خیالات کی ہمواری عبارت کی روانی، مثالوں کی چاشنی، تمثیلوں کی برجستگی، مواعظ وپند کی نسبت وشیرینی اہل ذوق کو والہ وشیدا بنا دیتی ہے[1]

مثنوی دولرانی خضر خاں

امیر خسرو نے اپنے "خمسہ" کی آخری مثنوی "ہشت بہشت" ۷۰۱ھ میں تمام کی۔ اس کے بعد مثنوی کے میدان میں ان کا دوسرا کارنامہ ۷۱۵ھ میں دولرانی خضر خاں کی تصنیف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ۷۰۱ھ اور ۷۱۵ھ کے درمیان ان کی کوئی شعری یا نثری تصنیف "خزائن الفتوح" کے علاوہ جو علاء الدین خلجی کی ۷۱۱ھ تک کی فتوحات پر مشتمل ہے، ہمیں دستیاب نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ امیر خسرو جیسا پرگو اور فعّال ذہن رکھنے والا انسان مسلسل چودہ سال تک خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زمانہ ان کی درباری زندگی کی مصروفیتوں اور سیاسی سرگرمیوں کا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دوران میں انھوں نے اپنے وہ سات رسائل تصنیف کیے ہوں جن کا مجموعہ "جواہر خسروی" کے نام سے موسوم ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

"دولرانی خضر خاں" عشقیہ، عاشقیہ اور عاشقیہ کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔ اس میں علاء الدین خلجی کے لڑکے شہزادہ خضر خاں اور راجہ کرن والی گجرات کی بیٹی دیول دئی کی تاریخی

---

[1] مثنوی کا باکمال شاعر، سید یوسف کمال بخاری مطبوعہ "خسرو شناسی" مرتبہ ظ۔ انصاری و ابو الفیض سحر شائع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔

داستان عشق نظم کی گئی ہے۔ یہ مثنوی امیر خسرو نے خود خضر خاں کی فرمائش پر تصنیف کی اور اس کے متعلق سارا مواد بھی فراہم کیا جیسا کہ اس مثنوی کے اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے چار ماہ اور چند روز میں لکھ کر ۶ ذوالقعدہ ۷۱۵ھ میں تمام کی۔ اس وقت اس کے اشعار کی مجموعی تعداد چار ہزار دو سو تھی لیکن خضر خاں وغیرہ کے واقعۂ قتل کے بعد امیر خسرو نے اس میں تین سو انیس اشعار کا اضافہ کر کے اشعار کی تعداد چار ہزار پانچسو انیس کر دی۔

اس سے قطع نظر کہ یہ مثنوی ایک تاریخی عشقیہ داستان پر مشتمل ہے اس کی ایک نمایاں خصوصیت اس کے ہندوستانی عناصر ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانی چیزوں سے امیر خسرو کا تعلق خاطر اور لگاؤ ان کی تصنیفات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ یہ مثنوی بھی ان عناصر سے خالی نہیں۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ، آب و ہوا، تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کے وافر حوالے ملتے ہیں۔ وہ ہندی زبان کو فارسی سے کم نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک صرف عربی ہی دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ جس طرح عربی دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے پاک ہے اسی طرح ہندی بھی خالص ہے۔ ہندی زبان کی صرف و نحو عربی صرف و نحو سے کم نہیں، معانی کے اعتبار سے بھی ہندی عاجز نہیں۔ ہندوستانی کپڑوں میں دیوگیری جو دیوگیری میں بنتا ہے اپنی نزاکت میں کتاں سے بہتر ہے ـــــ پان، آم اور انجیر اور ہندوستان کے پھول مثلاً بیلا، جوہی، کیوڑہ، رائے چمپا، مولسری ان تمام کا ذکر اس مثنوی میں موجود ہے ـــــ وہ ہندوستان کے نازک انداموں کو دنیا کے حسینوں پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے ہر مو میں سیکڑوں چین ہیں۔ مصر، روم، قندھار، سمرقند خطا و ختن، یغما و خلخ وغیرہ کے حسین ہندوستانی حسینوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس مثنوی میں صنائع و بدائع کی بھی کثرت ہے۔ دولرانی کو قصر لعل میں یوں دکھاتے ہیں جیسے شفق میں چاند، خضر خاں کی شادی کے موقعہ پر موتیوں کی بے قدری و خواری کو محبوب کے در پر عاشق کے آنسوؤں سے تشبیہ دیتے ہیں، نازنینوں کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ موتیوں پر چلتے رہنے کی وجہ سے ان کے تلووں میں آبلے پڑ گئے ہیں، گردش تیغ کشیدہ یوں ہے گویا لالہ کے گرد سوسن اُگے ہوئے ہیں ـــــ اس اعتبار سے یہ مثنوی اپنے جملہ محاسن کے معیار پر پوری اترتی ہے۔

مثنوی ”نہ سپہر“ کی تکمیل امیر خسرو نے جمادی الاوّل ۷۱۸ھ میں کی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال کی تھی اور قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی حکومت کا تیسرا سال تھا۔ اس مثنوی کا دوسرا نام ”سلطان نامہ“ بھی ہے۔ اس مثنوی کو امیر خسرو نے نو ابواب میں تقسیم کیا اور ہر باب کو ”سپہر“ کہا ہے۔ اس مثنوی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر باب کے اشعار کی بحر جداگانہ ہے گویا یہ مثنوی نو بحروں میں لکھی گئی ہے۔

”نہ سپہر“ کا موضوع تاریخی ہے اور اس اعتبار سے یہ امیر خسرو کی چوتھی تاریخی مثنوی ہے اور اس کو انھوں نے اپنے ممدوح سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی خواہش پر لکھا۔ اس مثنوی کا دیباچہ حمد، نعت، معراج اور حضرت سلطان المشائخؒ کی مدح پر مشتمل ہے۔ سپہر اوّل میں مبارک شاہ خلجی کے جلوس اور رفع بغاوت دیوگیر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ سپہر دوم میں دلّی کی عمارات، تلنگ اور ورنگل کی جنگیں بیان کی گئی ہیں۔ عظمت دہلی اور ساقی نامہ کے عنوانات کے تحت اشعار ہیں اور ایک غزل ہے۔ سپہر سوم میں ہندوستان کی تعریف، اس کی اقالیم، اس کے پھول، اس کے پرند اور جانور، ہندوستان کے مذہبی علوم اور یہاں کی زبانیں، سنسکرت زبان کی بزرگی اور ہرپادیو کی شکست کا ذکر ہے۔ سپہر چہارم میں بادشاہ، ولی عہد، امراء و روساء اور سپاہ و رعیت کو نصیحتیں کی گئی ہیں اور اخیر میں ایک غزل ہے۔ سپہر پنجم میں بادشاہ کے شکار کا ذکر، تیر و کمان کے درمیان مناظرہ، ساقی نامہ اور غزل ہے۔ سپہر ششم میں مبارک شاہ کے لڑکے شہزادہ محمد کی ولادت مذکور ہے اور ساقی نامہ اور غزل ہے۔ سپہر ہفتم میں بہار، نوروز، جشن تولد سلطان محمد، رقاصاؤں اور بزم ناو نوش کے تحت اشعار ہیں۔ سپہر ہشتم میں بادشاہ کی چوگان بازی، مناظرہ گوئے و چوگان کا بیان ہے اور ایک ساقی نامہ اور ایک غزل ہے۔ اور سپہر نہم میں ہندوستان کے شعرا کی عظمت، سعدؔی و ہمام کی تعریف، اپنے اشعار کی ستائش کی گئی ہے اور پھر مثنوی نہ سپہر کے اختتام کا ذکر ہے، ڈاکٹر وحید مرزا اس مثنوی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ”درحقیقت یہ نظم بحد وافر ایسے مواد سے پُر ہے جن کی تاریخی اور عمرانی اہمیت ہے اور بڑے اطمینان سے یہ دعوا کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی کی پوری تاریخ میں یہ مثنوی باعتبار ہیئت و مواد نادر مرتبہ رکھتی ہے...... یہ ایک ایسی نظم ہے جس کا مطالعہ اگر امعانِ نظر سے کیا جائے تو بہت سود مند ثابت ہو گا اور پھر اس کا

منصب بہتر طریقہ پر متعین کیا جا سکے گا۔[1]

تغلق نامہ

امیر خسروؔ کی تاریخی مثنویات کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی "تغلق نامہ" ہے۔ اس کا آغاز انھوں نے سلطان غیاث الدین تغلق کے دور حکومت میں کیا لیکن نہ تو غیاث الدین تغلق ہی زندہ رہا کہ اس مثنوی کو دیکھتا، نہ ہی خسرو اس کو مکمل کر سکے۔ اس کی تاریخ تصنیف کے بارہ میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ انھوں نے یہ مثنوی اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھی۔ حضرت شیخ المشائخؒ کا وصال ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو ہوا۔ اس وقت امیر خسرو سلطان غیاث الدین تغلق کے ساتھ کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انھیں اس اندوہناک سانحہ کی اطلاع ہوئی، چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام اپنے پیر و مرشد کی ماتم گساری میں گزارے اور بالآخر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو قید حیات سے آزاد ہو گئے۔ یہ مثنوی انھوں نے یقیناً سلطان غیاث الدین تغلق کی خواہش پر اس کی تخت نشینی کے بعد شروع کی ہوگی اس کی دریافت بہت بعد میں ہوئی۔ بادشاہ جہانگیر کے پاس بھی جو نسخہ تھا وہ اول و آخر ناقص تھا، چنانچہ اس نے حیاتیؔ کاشی کو حکم دیا کہ وہ اس کو پورا کرے۔ حیاتیؔ نے جو اشعار ابتدا میں اضافے کیے ان کی تعداد ۲۷۵۲ ہوتی ہے[2]

"تغلق نامہ" میں جن موضوعات کو نظم کیا گیا وہ درج ذیل ہیں،

خسرو خاں کے ذریعہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا قتل۔
خاندان خلجی کی تباہی۔
خسرو خاں کی دو ماہہ حکومت۔
غازی ملک کا غلبہ حاصل کرنا اور سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہونا۔

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا: امیر خسرو۔ حیات اور کارنامے (انگریزی)

[2] سید ہاشمی فرید آبادی، تغلق نامہ مطبوعہ امیر خسرو۔ احوال و آثار مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری۔

اس مثنوی میں بعض ایسے واقعات بھی مل جاتے ہیں جن کے ذکر سے ہماری تاریخی کتب خالی ہیں، اس کی شاعرانہ علمی و ادبی اہمیت نہ سہی لیکن یہ ایک قابل قدر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ــــــــــ یہ مثنوی حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

یہ تھا ایک اجمالی خاکہ امیر خسروؔ کی شاعرانہ شخصیت، غزل سرائی اور مثنوی نگاری کا، اب ہم ان کے نثری کارناموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان کی منظومات کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ ان کی یہ نثری یادگاریں خزائن الفتوح یا تاریخ علائی، اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز اور افضل الفوائد پر مشتمل ہیں۔

ان میں سے اول الذکر یعنی خزائن الفتوح تاریخ کی کتاب ہے اور اس میں امیر خسرو نے ۶۹۵ھ سے لے کر ۷۱۱ھ تک کی علاءالدین خلجی کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ خزائن الفتوح کے مشمولات ان سرکاری کاغذات پر مبنی ہیں جو امیر خسرو کو فراہم کیے گئے تھے۔ اس کتاب کے عنوانات حسب ذیل ہیں؛

۱۔ کڑہ اور مانک پور کی گورنری کے زمانہ میں دیوگیر پر علاءالدین کی فوج کشی۔
۲۔ دہلی کی جانب اس کا کوچ اور تخت نشینی۔
۳۔ حدود سلطنت میں امن و آشتی اور فلاح کے اقدامات اور الحاد و زندقہ کے انسداد کی تدابیر۔
۴۔ جامع مسجد، علائی مینار، دلی شہر کی فصیل اور شمسی تالاب کی تعمیر۔
۵۔ منگولوں کے خلاف کامیاب مہم اور سخت تعزیری اقدامات۔
۶۔ گجرات اور رنتھبور کی فتح۔
۷۔ مالوہ اور چتوڑ کی فتح۔
۸۔ ملک کافور کے تحت دیوگیر کے خلاف تعزیری مہم اور ۷۰۸ھ میں خود بادشاہ کے ذریعہ سوانہ کی فتح۔
۹۔ ۷۰۹ھ میں ملک کافور کی سربراہی میں تلنگانہ کی فتح۔
۱۰۔ ۷۱۰ھ میں ملک کافور کی سربراہی میں معبر کی فتح۔ اور

۱۱۔ ۷۱۱ھ میں فیروزمند افواج کا دلّی کی طرف کوچ[1]

امیر خسرو کی دوسری نثری کتاب "افضل الفوائد یا "راحت المحبین" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے پیرو مرشد شیخ المشائخ نظام الدین اولیا کے ارشادات و ملفوظات کو جمع کیا ہے اور یہ ۲۹ سال (۶۹۰ھ تا ۷۱۹ھ)[2] پر حاوی ہے یہ امیر حسن علا سنجری کی "فوائد الفواد" کے طرز پر تالیف کی گئی ہے جو خود حضرت شیخ المشائخ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے لیکن محققوں کا ایک گروہ اس کو الحاقی مانتا ہے۔ اس خیال کو امیر خورد، صاحب سیر الاولیا کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ۷۲۲ھ میں جب "فوائد الفواد" کا نسخہ مکمل ہو کر منظر عام پر آیا تو امیر خسرو نے کہا:

> "کاش کہ تمامی کتب کہ عمر دراں صرف کردہ ام برادر امیر حسن را بودے ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردہ است مرا بودے تا من بداں در دنیا و آخرت و مباہات کردمے۔"

چونکہ یہ بحث اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے اس لیے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

"اعجاز خسروی" جس کا دوسرا نام "رسائل الاعجاز" ہے امیر خسرو کی تیسری نثری تصنیف ہے جو پانچ رسالوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مصنّف نے نگارش و انشا، شعر و ادب اور صنائع لفظی و معنوی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ادب کے معیار کو بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے "اعجاز خسروی" کا پایہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے پانچویں رسالے میں امیر خسرو نے اپنے ایام شباب کی تحریروں کو شامل کیا ہے۔ اس میں ہجویات بھی ہیں اور کچھ خطوط بھی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہمیں امیر خسرو ان کے اقارب اور ان کے دوستوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ خطوط بالکل تخیلی ہیں اور اُن کا مقصد صرف نمونۂ انشا فراہم کرنا ہے۔

---

[1] امیر خسرو: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر وحید مرزا۔

[2] گزیدہ آثار امیر خسرو بلخی (معروف بہ دہلوی) جلد سوم، اطلاعات عامہ، وزارت اطلاعات و کلتور، افغانستان۔

اس کتاب کو امیر خسرو نے ۷۱۹ھ میں ختم کیا۔

اخیر میں ”جواہر خسروی“ کا ذکر اگر نہ کیا جائے تو امیر خسرو کی تصنیفات کی تعداد میں ایک اہم کمی رہ جائے گی۔ یہ نام امیر خسرو کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ کتاب مجموعہ ہے ان کے مختلف رسالوں کا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ نصاب بدیع العجائب۔
۲۔ نظم گھڑیال۔
۳۔ رباعیات پیشہ وراں، اس کا دوسرا نام ”شعر آشوب“ بھی ہے۔
۴۔ خالق باری۔
۵۔ ضمیمہ خالق باری (منظوم)۔
۶۔ چیستاں، اس میں پہیلیاں اور فارسی و ہندی دوسخنے شامل ہیں۔
۷۔ قاموس لغات ہندی۔

۱۹۱۸ء میں ان تمام منتشر اجزا کو یکجا کر کے کتابی شکل میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے شائع کیا گیا اور اس کا نام مرتبین نے ”لآلی عمان موسوم بہ جواہر خسروی“ رکھا۔

آیئے اب ذرا ہم امیر خسرو کو ماہر فن موسیقی کے روپ میں دیکھیں، یہ تو بہرحال ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قدرت نے انھیں بہت ہی خوش آہنگ، خوش الحان اور مترنم بنایا تھا۔ ان کے استاد خواجہ سعد الدین خطّاط نے خواجہ عزّ الدین سے ان کا تعارف ایک اچھے مغنّی کی حیثیت سے کرایا تھا۔ مؤخر الذکر نے انھیں ایک دیوان دیا جو اس وقت ان کے زیر مطالعہ تھا اور اس میں سے چند اشعار پڑھنے کے لیے کہا۔ اس وقت امیر خسرو بہت کم سن تھے لیکن اس کے باوجود خواجہ عزّ الدین نے ان کی آواز کی بہت تعریف و تحسین کی۔ ظاہر ہے امیر خسرو جیسے ہمہ پہلو ذہن رکھنے والے کے لیے فن موسیقی میں بھی مہارت حاصل کر لینا کوئی مشکل بات نہ تھی اور یہی نہیں کہ انھوں نے اس میں مہارت تامہ حاصل کی بلکہ اس میں ایجادات و اختراعات بھی کیں اور ہندوستانی موسیقی کو اپنی جودت طبع سے مالا مال کیا۔ درحقیقت قوالی کی موجودہ طرز انھیں کی ایجاد ہے۔ آلۂ موسیقی ستار (سی تار) کی ایجاد کا بھی سہرا انھیں کے سر ہے۔ انھوں نے ستار کے بجانے پر اتنی قدرت

حاصل کر لی تھی کہ موسیقی کے ایک مقابلہ میں انھوں نے اپنے معاصر ایک ممتاز موسیقار گوپال کو شکست دے کر "ناٹک" کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ یہ ایک ایسا منصب ہے جو اسی شخص کو عطا کیا جاتا ہے جو موسیقی کے فن میں ماہر اور استاد ہوتا ہے۔

امیر خسرو نے ہندوستانی اور فارسی موسیقی کے امتزاج سے بہت سے راگ ایجاد کیے۔ مولانا شبلی نعمانی نے درج ذیل راگ ان کی طرف منسوب کیے ہیں:

مجیر، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، زیلف، فرغنہ، سہ پردہ، باخرز، فردوست، منم (سغم) (صنم)[1]

ان کے علاوہ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط اور سوہلہ کو بھی انھیں کی ایجاد کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے واجد علی شاہ کی کتاب "صوت المبارک" کے حوالہ سے درج ذیل راگوں کو بھی خسرو کی ایجاد بتایا ہے: ترانہ، چھند، پربند، گیت، قول، قلبانہ، نقش اور گل[2]

اخیر میں اس باب کو امیر خسرو کے دوست اور ہم عصر مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کے اس اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے۔

> "سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں ایسے بہت سے بے مثال شاعر تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے اور نہ آج تک پیدا ہوئے ان سب میں امیر خسرو اپنے خیالات کی جدت اور شعروں کی کثرت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم و نثر کے اساتذہ صرف کسی ایک صنف سخن میں مہارت رکھتے ہیں لیکن ان کے برعکس امیر خسرو ہر صنف سخن میں کمال رکھتے ہیں، ایسا باکمال شاعر جو تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتا ہو نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔ ان کی ذہانت، قابلیت اور علم و فضل کے علاوہ وہ ایک صوفی بھی تھے، ہر روز روزہ رکھتے تھے اپنا زیادہ تر وقت قرآن خوانی، فرض اور نفل نمازیں پڑھنے میں گزارتے تھے، وہ حضرت

---

[1] مولانا شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۰۳۔

[2] ڈاکٹر وحید مرزا: امیر خسرو - حیات اور کارنامے (انگریزی)

نظام الدین اولیا کے خاص مرید تھے۔ اپنے مرشد کا اس قدر مخلص اور سچا عقیدت مند میں نے نہیں دیکھا۔ انھیں اپنے مرشد کا پیار بھی بھرپور ملا تھا، ان کی زندگی وجدان اور سرور و کیف میں بسر ہوتی تھی۔ موسیقی اور گانے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا!۔ خدا نے ان کو ایک فنکار اور مہذب انسان کی تمام صفات سے نوازا تھا۔ درحقیقت امیر خسرو جیسے عجیب و غریب انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ امیر خسرو اور ان کے دوست ایک دوسرے صوفی شاعر امیر حسن سے میری گہری دوستی تھی، وہ میرے بغیر خوش نہ رہ سکتے تھے اور ان کے بغیر مجھے چین نہیں ملتا تھا۔ میری وجہ سے ان دونوں میں بھی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اکثر ایک دوسرے کے گھر بھی جایا کرتے تھے[1]۔"

★★★★★

---

[1] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، منقول پروفیسر محمد حبیب: حضرت امیر خسرو دہلوی (انگریزی) ترجمہ: سلیم احمد مطبوعہ امیر خسرو مرتبہ سلیم احمد ادارہ ادبیات دلّی۔

٦

گزشتہ صفحات میں اس امر کی بخوبی وضاحت ہو چکی ہے کہ عربی و فارسی پر مہارت تامّہ کے علاوہ امیر خسرو کو ہندوستان کی دوسری بولیوں اور زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کے جو علمی و ادبی کارنامے ہمارے سامنے ہیں وہ اس حقیقت کا انکشاف بدرجۂ اتم کرتے ہیں کہ وہ ایک گوشہ نشیں اور عزلت پسند انسان نہ تھے۔ انھیں عوام میں بھی وہی مقبولیت و محبّت حاصل تھی جس کے مستحق وہ اپنے مربیوں میں سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہوں اور شہزادوں کی سرپرستی کے باوجود فارسی و عربی، طبقہ امرا، دانشوروں اور پڑھے لکھوں کی زبانیں رہیں اور یہ عوام میں مقبول نہ ہو سکیں۔ امیر خسرو کے عوامی شعور نے انھیں آگاہ اور متنبہ کر دیا تھا کہ انھیں اپنا رابطہ عوام کالانعام سے بھی رکھنا ہے اور یہ امر اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ وہ اپنے خیالات و افکار کے ابلاغ و ترسیل کے لیے عوامی زبان پر قدرت نہ حاصل کرتے، صرف یہی نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کے رسم و رواج اور طور و طریق کا غائر مطالعہ بھی ضروری تھا۔ ان کا یہ علم، یہ شعور، یہ واقفیت اور یہ آگاہی ان کی ان تحریروں سے بحسن و خوبی مترشح ہوتی ہے جو ہزاروں صفحات پر بکھری ہوئی ہیں۔ وہ ہندی زبان سے جسے وہ ہندوی کہتے ہیں بخوبی واقف تھے اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے ؎

ترک ہندوستانیم من، در ہندوی گویم جواب
شکّر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

(میں ایک ہندوستانی ترک ہوں، میں ہندوی میں جواب دیتا ہوں، میرے پاس مصری شکر نہیں جو میں عربوں کی گفتگو کروں)

ایک دوسرے موقعہ پر کہتے ہیں ؎

چوں من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

(اگر صحیح پوچھو تو میں ہندوستان کا طوطی ہوں، اگر تم مجھ سے شیریں گفتار چاہتے ہو
تو ہندوی میں بات کرو)

ایک اور مقام پر فارسی و ترکی زبانوں پر ہندوی کو یوں ترجیح دیتے ہیں ؎

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

یہ بہر حال ایک بہت بڑی ناانصافی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ ان کی ہندی یا ہندوی دانی سطحی تھی۔ انھیں اپنی ہندی نغز گوئی پر فخر تھا۔ ان کا یہ بیان کہ "جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ است[1] اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو اس زبان پر قدرت حاصل تھی؛ وہ اس کو پڑھ سکتے تھے، لکھ سکتے، بول سکتے تھے اور اس میں روانی سے اشعار کہہ سکتے تھے، لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ ان کا ہندی کلام محفوظ نہ رہ سکا اور غالباً خود امیر خسرو نے بھی ان کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہ کیا۔ بس وہی سرمایہ ہے جو یا تو سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے یا پھر مختلف تذکروں سے یکجا کیا گیا ہے۔ ہم تک ان کے چند دوہے، چند پہیلیاں، چند ڈھکوسلے، چند چیستاں، چند انملیاں، چند ہندی فارسی دو سخنے اور چند ہندی فارسی آمیختہ اشعار پہنچے ہیں؛ انھوں نے اپنے فارسی اشعار میں بلا تکلف ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے مثلاً ؎

سر آں دو چشم گردم کہ چوں ہندوان رہزن
ہمہ راز نوک مژگان بہ جگر زدہ کٹارا

مثنوی "تغلق نامہ" کے درج ذیل مصرعوں میں ہندی الفاظ اور فقروں کا استعمال ملاحظہ ہو ؎

سخن شاں "مار مار" و سر بسر "مار"
بہ زاری گفت "ہے ہے" تیر مارا
یکے از رواتاں "ہار گھر" بود

"خزائن الفتوح" میں درج ذیل ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے:

پترہ، کٹھ گر، تکہ، چندن، بسیٹھ، اچھوہ، تلواڑہ، مواسات، مواس[2]

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال ؛ امیر خسرو۔
[2] ڈاکٹر وحید مرزا ؛ خزائن الفتوح (انگریزی)

ذیل میں چند ایسے اشعار دیے جا رہے ہیں جن میں امیر خسرو نے بڑی آزادی کے ساتھ ہندی الفاظ اور فقروں کا استعمال کیا ہے ؎

شوخی ہندو بہ بیں کو دیں ببرد از خاص و عام
رام من ہرگز نہ شد ہر چند گفتم "رام رام"

پنبہ دہنا! چہ خوب روئی!   ولے چہ ڈقنا! کدام کوئی؟
از ہر طرف ترا بجستم   سوزن پلکا! کدام موئی؟

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات   لالہ غلام روئے تو، صد برگ زیرپات
چوں برہمن بدید رخ خوبت اے صنم   زنار را گسست دلکد زد بروئے لات

ہندو بچہ بیں کہ عجب حسن دھرے چھپے   بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھپے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم   گفتا کہ "ارے رام ترک کائیں کرے چھپے"[1]

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے   دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما! بہائے زلفت چہ بود   فریاد بر آورد کہ "دُر دُر موئے"[2]

گجری تو کہ در حسن و لطافت چوں مہے   ایں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد   ہر گاہ کہ می گوئی "دہی لیہو دہی"[3]

---

[1] فرہنگ آصفیہ محولہ پروفیسر گوپی چند نارنگ: امیر خسرو کا ہندوی کلام۔ استناد کا مسئلہ مطبوعہ 'خسرو شناسی'، اکتوبر ۱۹۷۵ء نئی دلی

[2] محمود شیرانی: پنجاب میں اردو۔

[3] ایضاً۔

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے   از دست و زبان چرب او دا دیلے
خالے برخش دیدم و گفتم کہ تل است   گفتا کہ "برو نیست دریں تل تیلے"[1]

ہندو صنمے کزو رخم شد کاہی   درواکہ ندارد زغمم آگاہی
گفتم زلبت کار من خستہ برآر   در خندہ شد و گفت کہ "ناہی ناہی"[2]

حجام پسر بخوبی و رعنائی   دی آئینہ بنمود بداں زیبائی
گفتم صنما در برت آیم، نایم   فریاد برآورد کہ "نائی نائی"[3]

ہندو بچہ دیدم چو شکر سرتاپا   حیراں کنمش چو بنیمش سرتاپا
با او گفتم کہ ہندو از چیست بگو   ہر موئے خطش گفت کہ "مورے باپا"[4]

مذکورہ بالا اشعار و رباعیات میں امیر خسرو نے بڑی بے باکی اور برجستگی کے ساتھ ہندی الفاظ اور فقروں کا استعمال کیا ہے۔ چونکہ خسرو کی یہ کاوش شعوری رہی ہے اس لیے قابل قدر اور سزاوار تحسین ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستانی لسانیات و ادبیات کی تاریخ میں اس کی حیثیت ایک نادر اور انوکھے تجربہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں اس کا مقصد صرف تفریح و تفنن ہی رہا ہو لیکن آج ہم اس تجربہ میں ایک نئی زبان کی ابتدا دیکھتے ہیں جس کو ابوالفضل نے "دہلوی" کا نام دیا، پھر لوگوں نے اس کو ریختہ کی حیثیت سے جانا اور بالآخر یہ زبان "اردو" کی شکل اختیار کرکے تخت دلی کی سرکاری زبان ہوگئی۔ مسلمانوں کی آمد ہی کے وقت سے ثقافتی و تہذیبی کے علاوہ لسانی آمیزش

---

[1] جواہر خسروی، رباعیات پیشہ وراں۔

[2] ایضاً۔

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً۔

کا عمل شروع ہو چکا تھا، عربی، فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے الفاظ کا باہم تبادلہ ہوتا رہا اور ایک نے دوسرے کو متاثر کیا، چنانچہ اشعار میں ہمیں خسرو سے پہلے بھی یہ عمل نظر آتا ہے منوچہری کا شعر ملاحظہ ہو ؎

الا تا مومناں دارند روزہ
الا تا ہندواں گیرند لنگھن

تہذیبی ارتقا کا یہ ایک غیر شعوری عمل تھا اور اس کو کوئی طاقت بھی روک نہیں سکتی تھی۔ امیر خسرو نے اس سمت شعوری اقدام کیا اور وہ ایک نئی زبان کے بانی اور موجد ہو گئے جس نے ہمارے مشترکہ تمدن کو مختلف طریقوں سے مالا مال کیا اور ان قوتوں میں اضافہ کیا جو ایک نئے معاشرتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔

فارسی، ہندی آمیختہ شاعری کے علاوہ امیر خسرو نے خالص ہندی میں بھی اشعار کہے ہیں ان کی جانب بہت سے ہندی دوہے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں سے چند ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھو ندیس[1]

خسرو رین سوہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھیے اک رنگ[2]

چکوا چکوی دو جنے انھیں نہ مارے کوئے
ایہ مارے کرتار کے رین بچھوہا ہوئے

---

[1] جواہر خسروی ص ۱۵۷، جن حالات میں یہ دوہا کہا گیا ان کا ذکر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے ضمن میں میں آ چکا ہے۔

[2] ایضاً ص ۱۵۳

خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوئے
پوت پرائے کارتے، جل جل کوئلا ہوئے[1]

شیام سیت گوری لے جنمت بھئی انیت
اک پل میں بھر جات ہیں جوگی کا کے میت[2]

بظاہر کوئی ایسا سبب نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم امیر خسرو کی جانب ان دوہوں کی نسبت کو مشتبہ تصور کریں۔ یہ امر افسوسناک ضرور ہے کہ ان کا ہندی کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔

الغرض امیر خسرو دو عظیم تمدنوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس خشت کو بیچ سے نکال دیجیے اور پوری عمارت متزلزل ہو جائے گی۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی اس محبت سے ابھرتا ہے جو انھیں ہر ہندوستانی چیز سے ہے۔ وہ خواہ ہندوستانی آب و ہوا ہو یا ہندوستانی ماحول، ہندوستانی زبانیں ہوں یا ہندوستانی تمدن و ثقافت، ہندوستانی مذاہب ہوں یا ہندوستانی فضائیں اور خواہ ہندستانی باشندے ہوں یا ہندوستانی برگ و بار، انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے، یہاں پلے، یہاں بڑھے اور یہیں ان کا نشو و نما ہوا۔ وہ ہندوستان کو دنیا کے دوسرے ملکوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وطن کی حیثیت "جنّتِ عدن" کی ہے۔ وہ ہندستان سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ وہ ان کا وطن ہے اور رسول مقبولؐ کے فرمان کے مطابق وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔ ان کی نگاہوں میں ہندوستان، خراسان و قندھار اور روم سے بہتر ہے۔ اس ملک کے باغ سدا بہار رہتے ہیں اور سال بھر نکہتِ گل سے معمور رہتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی پھولوں میں چمپا، کیوڑا، گلاب، لالہ، نسترن، دونا کرنا، ڈھاک، سیوتی، جوہی، مولسری، نیلوفر، صد برگ، گل سفید، گل کوزہ، گل زریں، گل سرخ، بیلا، سوسن اور کبود وغیرہ کا ذکر بڑی شیفتگی سے کیا ہے۔ وہ آم کے بہت دلدادہ اور خربوزہ

---

[1] شفیق، لچھمی نرائن، چمنستان شعرا مرتبہ مولوی عبدالحق (اورنگ آباد) ص ۱۰۲۔

[2] ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی: امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری، لکھنؤ ۱۱۹ء۔

کے بہت شائق ہیں۔ پان کو بھی وہ ہندوستان کے منتخب پھلوں میں شمار کرتے ہیں جو صحت بخش ہوتا ہے اور جسم میں تولید خون کا سبب بنتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ یہاں کے پھولوں کے نام ہندوستانی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک باغ بہشت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح امیر خسرو ہندوستانی کپڑوں کی تعریف میں بھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ انھیں دیوگیری کی ململ خاص طور پر متوجہ کرتی ہے جس میں پری وشانِ ہند ملبوس رہتی ہیں۔ ہندوستانی طوطی ان کے نزدیک اس لیے قابل تحسین ہے کہ وہ آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے اور انسانوں کی طرح مصروف گفتگو ہوتا ہے۔ ہندوستان ان کے لیے اس لیے بھی جنّت ہے کہ اس میں ایک فردوسی طائر مور بھی پایا جاتا ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مور ہندوستان کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔

ان کے دل و دماغ پر ہر وقت ان کا اپنا شہر دلّی چھایا رہتا ہے۔ وہ کہیں بھی جائیں وہ اس خوبصورت شہر کو فراموش نہیں کر پاتے تھے۔ ان کے نزدیک دلّی عدل و صداقت کا خزانہ ہے۔ دلّی اپنی اچھائیوں و خوبیوں کی بنا پر باغ بہشت کی طرح ہے۔ وہ اس شہر کی ان عمارتوں کی توصیف کرتے ہیں جن سے اس شہر کی آرائش ہے، اگر مکّہ اس باغ کے متعلق سُن لے تو وہ ہندستان کا طواف کرنے لگے۔ دلّی کی جامع مسجد ہمدوش حرم محترم ہے۔ قطب مینار وہ زینہ ہے جس کے ذریعہ آسمانوں تک جایا جاسکتا ہے۔ حوض خاص کا پانی نور سماوی کا چشمہ ہے جس میں آسمان منعکس ہوتا ہے۔ دلّی عظیم شاہوں اور شہنشاہوں کا دار السلطنت ہے جہاں پر اساتین حکومت رہتے ہیں۔ اس شہر کے رہنے والے فرشتہ کردار و قدسی سیرت ہیں اور کوئی بھی ان سے ادب و شعر، موسیقی و رقص اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں میں بازی نہیں لے جاسکتا۔ سیم تنان دلّی بھلا کس طرح امیر خسرو کے ناوک ذوق جمال سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ دلّی کے بتان سادہ ہر وقت اور ہر جگہ ان کے دل و دماغ پر حاوی رہتے ہیں۔ وہ غایت نازکی وجہ سے کسی کی کوئی بات نہیں مانتے۔ جس راہ پر وہ محو خرام ہوتے ہیں وہاں پھول کھل جاتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ تغافل پیشگان حسن و رعنائی آگے آگے ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے عاشقان نامراد کا ایک ہجوم ہوتا ہے جن کی آنکھوں سے خوناب رواں ہوتا ہے۔ ان نازنینوں کے سر میں نخوت جمی ہوتی ہے اور یہ شیفتگان جمال اپنے متاع دل و دیں کو غارت کرنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ الغرض یہ کہ اِن مُغبچوں نے خسرو کو بھی سرمست

وخراب کر دیا اور وہ بھی ان کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔

مختصراً یہ کہ خسرو نے ہندوستانی ثقافت کے ہر پہلو کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے ہندوستانی ثقافت اور زندگی سے جتنا کچھ ممکن تھا فائدہ حاصل کیا۔ جو شئے بھی اس سرزمین سے تعلق رکھتی تھی وہ ان کی توجہ کا مرکز بنی۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہے کہ خود اپنے قول کے مطابق وہ متعدد ہندوستانی زبانیں جانتے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل وہ آگے چل کر یوں بیان کرتے ہیں کہ ان زبانوں میں سے کچھ کی وہ شُد بُد رکھتے ہیں۔ کچھ سے وہ بخوبی آشنا ہیں اور کچھ کو انھوں نے اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، یا پھر ان سے عقل و بصیرت اور علم و دانشوری حاصل کی۔ انھوں نے بہت سی زبانوں کے نام دیے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ ایک زبان جس کا نام سنسکرت ہے ایسی ہے جو اپنے دامن میں علوم و فنون کا خزانہ رکھتی ہے۔ امیر خسرو کے قول کے مطابق یہ زبان قواعد و ادب اور دیگر علوم میں فارسی سے بلند اور عربی کے مساوی ہے۔" "کلیلہ دمنہ" جس میں صرف عقل و دانش ہی کی باتیں ہیں یہیں لکھی گئی اور اسی زبان میں لکھی گئی۔ ہندوستان کی فضیلت علمی پر انھوں نے دس دلائل قائم کیے ہیں، ان میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ موسیقی کی جو ترقی ہندوستان میں ہوئی کہیں نہیں ہوئی اور یہ کہ ہرنوں پر ہندوستانی موسیقی نشہ کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔

امیر خسرو ہندوؤں کو اسلام ماننے والوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ ہندو مذہبی اعتبار سے وجود باری تعالیٰ اور ہستی و قدم کو مانتا ہے اور وہی ذات اس عالم ایجاد کو عدم سے وجود میں لانے والی ہے، وہی ہر عارف و عامی، زاہد و عاصی کو رزق دیتا ہے، وہی ہر جاندار کو زندگی بخشتا ہے، ہر خیر و شر اور نیکی و بدی کا وہی خالق ہے، اس کی حکمت و حکم ازلی اور ابدی ہیں، وہی ازل سے ہر جزوِ کل کا فاعلِ مختار ہے۔ امیر خسرو کے خیال کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت سے عقائد مشترک ہیں، اسی طرح وہ چاروں ویدوں کا بھی ذکر بڑی تعریف سے کرتے ہیں اور انھیں گنجینۂ حقائق و معارف تصور کرتے ہیں۔

جیسا کہ پچھلے کسی باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی نظرِ کیمیا اثر نے خسرو کی قلبِ ماہیت کر دی تھی اور وہ بھی اپنے پیرِ روشن ضمیر سے اس طرح وابستہ ہو چکے تھے کہ ان کے پائیں مدفون ہو کر آج بھی ان سے قریب ہیں ناصیۂ پیران کے لیے جہان نور و حضور دونوں ہے اور صفات الٰہیہ میں سے ایک ہے۔ دیں پروری کی صفت کے اعتبار سے ان کی سیرتِ میمون نسخۂ دیباچہ

پیغمبری ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ گوشہ نشین نہیں ہوئے اور انھوں نے ترک دنیا نہیں کیا لیکن انھوں نے اپنے کردار کو ایک صوفی صافی کے کردار میں ڈھال لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ تصوف اور علماء ظاہر کے کردار کے اس پہلو سے بے خبر نہیں ہوئے جس میں مکر و ریا اور سالوس و تزویر کو دخل حاصل تھا، وہ ایسے لوگوں کو طائفۂ زرق ساز سے تعبیر کرتے ہیں جن کی آستینیں کوتاہ ہوتی ہیں اور ہاتھ دراز، . . . . . . فقر کے دعوے کے ساتھ طلب زر کا بھی عمل جاری ہے۔ فقر کسے کہتے ہیں اور تجارت کسے کہتے ہیں، ان کے نزدیک وہ رند مقامر، جو پاکباز ہوتا ہے بہتر ہے اس عبادت گزار سے جس کی عبادت میں حرص و آز شامل ہو، جو عاشق زر ہوتا ہے وہ عاشق درگاہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس راہ میں دوئی بار نہیں پا سکتی۔ اگرچہ شریعت نے کسب زر کی اجازت دی ہے لیکن منزل فقر میں یہ فریب کے مترادف ہے[1]

امیر خسرو نے صرف یہی نہیں کہ صوفیوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا بلکہ اس کسوٹی پر اپنی ذات کو بھی رکھ کر کسا اور اپنے نفس کو نفرین کی، انھوں نے بہت چاہا کہ اپنے تن ارجمند کو زندان عصمت میں مقید کر لیں، ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں انسانوں کا گزر نہ ہو اور دنیا کی ہر چیز سے دامن کھینچ لیں، لیکن چوں کہ توفیق الٰہی نہیں تھی اس لیے ظلمت نفس کیوں کر دور ہو سکتی۔ ان کی عنان حیات کو دیو حرص و آز نے پکڑ رکھا ہے، جسم میں جو روح کا زنداں ہے شیطانوں کا ایک ہجوم ہے، اندر تو نفس جو دشمن ہے سر ابھارتا ہے لیکن باہر شیطان کے لیے کمین میں بیٹھتا ہے، اندرون خانہ وہ شہوات و لذات سے حظ اندوز ہوتے ہیں اور بیرون در اپنی پارسائی کا دم بھرتے ہیں . . . . . الغرض یہ کہ عمر پچاس سال کے قریب ہو گئی ہے لیکن ان مکروہات سے توبہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ . . . . . . لیکن پھر ایک ایسا نور طلوع ہوا جس نے چراغ طرب کو گل کر دیا اور نشاط حریفاں دل سے دور ہو گیا، دل عیش کی رغبت سے سیراب ہو گیا اور طبیعت نے کرب و نخوت سے ابا کیا، ساقی کی آواز ناؤنوش ماند پڑ گئی اور صراحی کا سلام قبول کرنے سے انکار کر دیا، آتش طبع پیر نے خسرو کو پختہ کر دیا اور ہوس خام کا سودا سر سے نکل گیا[2]

---

[1] قران السعدین۔

[2] آئینۂ سکندری، مطبوعہ علی گڑھ۔

امیر خسرو کے نزدیک زندگی چند اقدارِ عالیہ سے عبارت ہے۔ یہ کوئی زندگی نہیں ہوئی کہ انسان پیدا ہوا، اس نے جوں توں زندگی گذاری اور پھر آغوشِ لحد میں سو گیا۔ نقشِ حیات میں رنگ ان تصورات کو عمل میں لانے سے پیدا ہوتا ہے جو زندگی کو جمالِ معنوی، سربلندی اور سرفرازی عطا کرتے ہیں حق و صداقت، علم و عقل، محبت و مروت، حلم و عطا، ہمدردی و دلسوزی، غیرت و عزتِ نفس، صبر و ثبات، سیر چشمی و کشادہ دستی، رحم و کرم ہی وہ رختِ سفر ہیں جن کی معیت میں قافلۂ حیاتِ انسانی کامیابی و کامرانی اور فتح و فیروزمندی کے ساتھ منزل کے جانب اپنے مراحل طے کرتا ہے اور یہی چیزیں انسان کو حیوانوں کے مقابلہ میں ممیز و ممتاز کرتی ہیں ــــــــ خسروؔ کے مذاقِ شعر و سخن نے انھیں زندگی کے اس اہم پہلو سے بے خبر نہیں کیا، چنانچہ ہم ان کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں جو حکمت و دانش اور پند و موعظت سے پُر ہیں، اپنی مثنویات "لیلیٰ مجنوں"، "شیریں فرہاد" اور "آئینہ سکندری" میں انھوں نے علی الترتیب اپنے تین بیٹوں عین الدین خضر، مسعود اور امیر حاجی کو تفصیل سے نصیحت کی ہے "ہشت بہشت" میں اپنی بیٹی کو بھی باعفت اور پاکدامن رہنے کی تاکید کی ہے۔ اسی مثنوی میں انھوں نے سلطان علاء الدین جیسے جاہ و جلال والے بادشاہ کو بھی نصیحتیں کی ہیں اور اس کو ان فرائض سے آگاہ کیا ہے جو اس پر بادشاہ کی حیثیت سے عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی پر ایک بافراغت اور خوش حال معاشرہ کا دار و مدار ہے[1]

یہ ہیں امیر خسرو کے عقائد و افکار، جذبات و احساسات، زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ان کے تصورات، اور اس ملک، وہاں کے لوگوں اور ان کی ہر چیز سے ان کا جذبۂ محبت و شیفتگی جس میں وہ پیدا ہوئے، بڑھے اور پھر اسی کی خاک میں ابدالآباد تک کے لیے مخفی و مستور ہو گئے۔ وہ گوشہ نشین نہیں تھے، وہ کارزارِ حیات میں نبرد آزما رہے، انھوں نے گہرائی سے ہندوستانی تمدن کا مطالعہ کیا، اس کو اپنے کردار میں جذب کیا۔ اگر وہ زاویہ نشین ہو جاتے تو انھیں وہ قبولِ عام نہ حاصل ہوتا جو ہوا، جو کچھ انھوں نے لکھا وہ ان کے تجربات

---

[1] تفصیل کے لیے اس کتاب کے دوسرے باب کی طرف رجوع کیجیے۔

کا نتیجہ تھا اور ان کی وہ وسعت مشرب جو قدرت نے انھیں ودیعت کی تھی ـــــــ جب ہم امیر خسرو کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی فرد واحد نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصود اس تمدنی ارتقا و سرگرمی کی متحرک رفتار کی جانب اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ امیر خسرو جس کی جولانگاہ تھے اور جس کو انھوں نے اپنی مکمل شخصیت کے ذریعہ توانائی بخشی اور بسرعت آگے بڑھایا، چھ سو سال سے زائد کا عرصہ ـــــــ یہ وہ مدت ہے جو کسی قوم کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فرد کا تو ذکر ہی کیا ـــــــ گذرجانے کے بعد بھی ان کی یاد آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے دانشوروں اور صاحبان علم و فضل کے درمیان آج بھی وہ مقبول ہیں، عوام الناس کی نگاہوں میں وہ اسی طرح عزیز ہیں اور شعر و سخن کی ناطورۂ طناز کے لیے وہ اسی طرح عزیز ہیں گویا کہ وہ آج بھی اپنے مادّی وجود کے ساتھ ہم میں موجود ہیں۔ سچ ہے بقول میر ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان ابھرتے ہیں

* * * * *

انتخاب

فی توحید باری تعالیٰ

اے زخیال ما بروں در تو خیال کے رسد   باصفت تو عقل را لاف کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک، خاک شوند بر درت   دامن عزّت ترا گرد زوال کے رسد
کنگرۂ کبریائے تو ہست فراز لامکاں   طائر ما دراں ہوا بے پر و بال کے رسد
بردر بے نیازیت صد چو حسین کربلا   تشنہ بماند برگزرتا بہ زُلال کے رسد
ہست بہ تختگاہ دل جلوۂ قرب روز و شب   لیک بجلوۂ چناں بچشم خیال کے رسد
زاں چمنے کہ بلبلش روح قدس نمی سزد   گلخنیان خاک را بوئے وصال کے رسد
توسن چابکاں سبک عرصۂ کوئے پنکواں   آنکہ فتاد مرکبش برسر حال کے رسد
جرعۂ دُرد عاشقاں برسر چوں منے چکد   راہ روان پاک را لوث وبال کے رسد

آیت رحمت از حرم ہست برائے حاجیاں
خسرؔو بت پرست را جز خط و خال کے رسد

فی نعت سیّد المرسلین خاتم النبیین
محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے رسالت را عَلَم افراختہ   دست تو تیغ شریعت آختہ
مرکبت کو برمکاں بنہاد پائے   قدر تو بر لامکانش تاختہ
آدم و من دونہ، تحت اللوا   آمدہ چوں تو لوا افراختہ
منہ قبائے چرخ را خیاط صنع   خاص بہر قامتت پرداختہ
میم احمد را گزیدہ بعد ازاں   خاتمِ مُہرِ نبوت ساختہ
ہر کہ او از میم احمد طوق یافت   در یکی گوئی رود چوں فاختہ
جز خدا کس قدر تو نشناخت زانک   کس خدا را ہمچو تو نشناختہ
تاختہ نور تو از روز ازل   پرتو خود تا ابد انداختہ
دیدہ کش در نظر ناید بہشت   عشق با خاک خیانت باختہ
عاصیانِ زرد رو را کردگار   از برائے روئے تو بنواختہ

بندہ خسرو تا نوید نعت تو
زاتشِ دل جان خود بگداختہ

در مدح سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا

اے شربت عاشقی بجامت   وز دوست زماں زماں پیامت
در سیر وصال ہر دو عالم   داخل بمسافتِ دو گامت
شد سلک فرید از تو منظوم   زانست کہ شد لقب نظامت
صد جان شریف پاک راچرخ   بگداخت و نوشتہ نامت
درگاہ تو قبلہ و ملائک   پرّاں چو کبوتراں ببامت
سودا زدگانِ شوق حق را   تسکیں ز مفرح کلامت

جاوید بقاست بندہ خسرو
چوں شد بہزار جاں غلامت

غزلیات

①

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بچنیں روز ز دلدار جدا
ابر و باران و من و یار ستادہ بوداع
من جداں گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا
سبزہ نو خیز، و ہوا خرّم و بستاں سرسبز
بلبل روئے سیہ ماندہ ز گلزار جدا
اے مرا در تہ ہر موئے ز زلفت بندی
چہ کنی بند ز بندم ہمہ یک بار جدا
دیدہ از بہر تو خونبار شد اے مردم چشم
مردمی کن، مشو از دیدۂ خونبار جدا
بنعمت دیدہ نخواہم کہ بماند پس ازیں
ماندہ چوں دیدہ ازاں نعمت دیدار جدا
دیدہ صد رخنہ شد از بہر تو، خاکے ز رہت
زود برگیر و بکن رخنۂ دیدار جدا
می دہم جاں مرو از من، وگرت باور نیست
پیش ازاں خواہی و بستان و نگہدار جدا
حسن تو دیر نپاید چو ز خسرو رفتی
گل بسے دیر نباشد چو شد از خار جدا

۲

جان من از آرام شد، آرام جان من کجا   ہجرم نشان فتنہ شد، فتنہ نشان من کجا
آمد بہار مشک دم، سنبل دمید و لالہ ہم   سبزہ بصحرا زد قدم، سرو رانِ من کجا
از گریہ ماندم پا بگِل، وز دوستان گشتم خجل   جاں از جہاں بگسست دل، جان و جہان من کجا
در کارِ غم شد موریم، بے پردہ شد مستوریم   تلخ است عیش از دوریم، شکر فشان من کجا
شخصم ضعیف و دیدہ تر، زاں ریسمان وزیں گہر   اینک مہیا شد کمر، لاغر میان من کجا
ہر دم جگر در سوز و تاب، از دیدہ ریزم خون ناب   اینک مَے و اینک کباب، آں میہمان من کجا
من جور آں نا مہرباں، دارم ز خاموشی نہاں   اویم نیاید بر زباں، کاں بے زبان من کجا

جان است آں یار نکو رفتہ دل خسرو دراو
گر دل نہ رفتہ است ایں بگو، ایں گو کہ جان من کجا

۳

بشگفت گلہا در چمن، اے گلستان من بیا   سرو ایستادہ منتظر، سرو روان من بیا
از گریۂ من ہر طرف، پر لالہ و گل شد زمیں   وقتے بگلگشت اے صنم، در گلستان من بیا
حیف است دیدن بے رخت در بوستاں آخر گہی   اے گل نہاں از باغباں، در بوستان من بیا
ہر طرۂ تو آفتے، ہر نرگس تو فتنۂ   گرچہ بلائے عالمے، از بہر جان من بیا
تلخے کہ گوئی نیست آں، از تلخی ہجرت فزوں   باایں ہمہ تلخی خود، شکر فشان من بیا

دانی کہ ہستم در جہاں، من خسرو شیریں زباں
گر نائی از بہر دلم، بہر زبان من بیا

۴

اے باد برقع برفگن آں روئے آتشناک را
وے دیدہ گر صفرا کنم، آبے بزن ایں خاک را
اے دیدہ کز تیغ ستم، ریزی ہمی خوں دمبدم
یا جان من بستاں زغم، یا جاں دہ ایں غمناک را
ریزی تو خوں بر آستاں، شویم من از اشک رواں
کالودہ دیدن چوں تواں آں آستان پاک را
زاں غمزہ عزم کیں مکن، تاراج عقل و دیں مکن
تاراج دیں تلقیں مکن آں ہندوئے بیباک را
آں دم کہ می پوشی قبا، مخرام از بہر خدا
پوشیدہ دار از چشم ما آں قامت چالاک را
سرہائے سرداران دیں، بستی چو بر فتراک زیں
زینساں میفگن بر زمین دنبالۂ فتراک را
تا شمع حسن افروختی، پروانہ دارم سوختی
پردہ دری آموختی آن دامن صد چاک را
ہرگز لبے ندہی بمن در بوسۂ گوئی بزن
آیم چو نزدیک دہن، رہ گم شود ادراک را
جانم چو رفت از تن بروں وصلم چہ کار آید کنوں
ازیں زہر بگذشت از فسوں ضائع مکن تریاک را
گوئی برآمد گاہ خواب، اندر دل شب آفتاب
آندم کز آہ صبح تاب آتش زنم افلاک را

خسرو کدا ایں خس بود کز سوز عشق از بس بود
یک ذرہ آتش بس بود صد خرمن خاشاک را

۵

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
تنم از بیدلی بیچارہ شد، بیچارہ تر بادا
بتاراج عزیزاں زلف تو عیارئے دارد
بخونریز غریباں، چشم تو عیارہ تر بادا
رخت تازہ است و بہر مردن خود تازہ تر خواہم
دلت خارہ است و بہر کشتن من خارہ تر بادا
گر اے زاہد دعائے خیر می گوئی، مرا ایں گو
کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا
ہمہ گویند کز خونخواریش خلقے بجاں آمد
من ایں گویم کہ بہر جان من خونخوارہ تر بادا
دل من پارہ گشت از غم نہ زانگونہ کہ بہ گردد
وگر جاناں بدیں شاد است یارب پارہ تر بادا

چو با تر دامنی خو کرد خسرو با دو چشم تر
بآب چشم مژگان دامنش ہموارہ تر بادا

۶

سایہ وارم ہرشب ار سودائے زلفت چوں کنم — چند گرد خویشتن گہ سحر، گہ افسوں کنم
از دل بدخوئے خونابہ دارم کہ گر — قطرۂ از دل بروں ریزم، جگر ہا خوں کنم
تو بہ بند کشتن من، من بر آں کز دوستی — عمرِ خود را بگسلم در عمرِ تو افزوں کنم
گوہرے دارم کہ در وے نیست جز لولوئے خام — چوں نثار خاک پایت لولوے مکنوں کنم
چند گوئی عشق را از دل بران و خوش بزی — گر توانم جان خود از دست تو بیروں کنم
گفتہ ام دل را چرا از عشق ناری سوئے زہد — دہ کہ شاہد خانۂ را وقف مسجد چوں کنم

روح مجنوں آید و آموزد آیتہائے عشق
شعر خسرو گر رقم بر تربت مجنوں کنم

۷

تنگ نبات چوں بود، لب بکشا کہ ہم چنیں — آب حیات چوں رود، خیز و بیا کہ ہم چنیں
ہر کہ بگویدت کہ تو دل بچہ شکل می بری — از سر کوئے ناگہاں مست برآ کہ ہم چنیں
ہر کہ بگویدیت کہ جاں چوں بود اندرون تن — یک نفسے بیا، نشیں در برِ ما کہ ہم چنیں
ہر کہ بگویدیت کہ گل خندہ چگونہ می زند — غنچۂ شکّرین خود باز کشا کہ ہم چنیں
ور بتو گوییم اے پسر کت بکنار چوں کشم — تنگ بہ بند بر میاں بند قبا کہ ہم چنیں
لاف وفا زنی ولے نیست برائے نام را — در تو نشانی از وفا ہم بو فا کہ ہم چنیں

ہر کہ نخواند ہیچ گہ نامۂ عشق چوں بود
قصۂ حال خسروش باز نما کہ ہم چنیں

۸

اے قامتت چوں شاخ گل، از برگ گل خنداں تری
چوں لالۂ تر نازکی، چوں سرو در بستاں تری
گل داشت وقتے بوئے تو، آمد بدعوی سوئے تو
از آفتاب روئے تو شد خشک با چنداں تری
یارب چہ اندام ترست آں کت بہ پیراہن درست
آب حیات ارچہ ترست اما ندارد آں تری
اکنوں کہ برنامی شوی، آرام دلہا می شوی
ہر چند دانا می شوی از کودکاں ناداں تری
با عہدت اے پیماں شکن گفتی نمی آرم سخن
کز عہد زلف خویشتن بد عہد و بد پیماں تری
یوسف بہ ہفدہ قلب اگر ارزاں بود اندر نظر
گر جاں دہم عالم برازوے بسے ارزاں تری
گفت منت آید گراں وز چوں توئی من برکراں
خوبی و رعنائی از آں ہر روز نافرماں تری
گر جاں کند خسرو زیاں با تو چہ در گیرد از آں
کز بہر جان عاشقاں ہر روز نا فرماں تری

۹

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم، در حسن ازاں زیبا تری
ہرگز نیاید در نظر نقشے ز رویت خوب تر
حوری ندانم اے پسر فرزند آدم، یا پری
آفاق را گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری
اے راحت و آرام جاں، با قد چوں سرو رواں
زینساں مرو دامن کشاں کارام جانم می بری
عزم تماشا کردہ ای، آہنگ صحرا کردہ ای
جان و دل ما بردہ ای این ست رسم دلبری
عالم ہمہ یغمائے تو، خلقے ہمہ شیدائے تو
آں نرگس رعنائے تو آوردہ کیش کافری
من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

۱۰

کج کلہا، کماں کشا، تنگ قبائے کیستی
لابہ گرا و دلبرا، عشوہ نمائے کیستی
زیر کلاہ، جُعد تو بر کمرت کشیدہ سر
بستہ بچابکی کمر، چست قبائے کیستی
مرکب ناز کردہ زیں، دادہ بہ تیغ غمزہ کیں
ساختہ آمدہ چنیں باز برائے کیستی
سینۂ بندہ جائے تو دیدہ بزیر پائے تو
ما ہمہ در ہوائے تو، تو بہوائے کیستی
تارخ خود نمودہ ای جاں ز تنم ربودہ ای
کاہش من فزودہ ای، مہر فزائے کیستی
خانۂ جاں ہمی برس، دانۂ دل ہمی خوری
نیک بلندی پری، مرغ ہوائے کیستی
خسرو خستہ را سخن، بستہ شد از تو در دہن
طوطی شکّرین من، نغز ندائے کیستی

* * * * *

فارسی و ہندی ممزوج غزل

ز حال مسکیں مکن تغافل ، درائے نیناں ، بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد خرابیم صبر وتسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں ، چو ذرّہ حیراں ، ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں ، نہ انگ چیناں ، نہ آپ آویں ، نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کی درائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گھتیاں

مثنوی گھڑیال

گر کسے پرسد اے خرد افروز   کہ چہ رفت و چہ ماندہ است از روز
تو بگویش بگیر ز انگشتم   آں یکے را کہ خواہی از دستم
با تو گویم ہر آنچہ گفت حکیم   از رہ تجربہ و طبع سلیم
گر سر انگشت گیردت بے شک   دہ[10] بود یا کہ چاردہ[14] یا یک[1]
در بگیرد سر شہادت تو   شش[6] بود یا کہ یازدہ[11] یا دو[2]
در بگیرد میانہ را اے جاں   سہ[3] و ہفت[7] و دوازدہ[12] می داں
بنصرت را چو گیرد او ناچار   ہشت[8] یا سیزدہ[13] بود یا چار[4]
و رسوئے خنصرت نماید رنج   نہ[9] بود یا کہ پانزدہ[15] یا پنج[5]

لیک باید ترا تمیز تمام
تا مگر چاشت را نہ گوئی شام

مکرنی

سگری رین مورے سنگ جاگا   بھور بھئی تب بچھڑیاں لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا   اے سکھی ساجن، نا سکھی دیا

آپ جلے اور موہے جلائے   پی پی کر مرد منھ بھر آوے
ایک میں اب ماروں گی مُکّا   اے سکھی ساجن، نا سکھی حُکّا

نت مورے کھاتر بجارے آوے   کرے سنگار تب جو مایا پاوے
من بگڑے نہ رے، راکھت مان   اے سکھی ساجن، نا سکھی پان

ذو سخنہ ہندی

روٹی جلی کیوں؟ گھوڑا اڑا کیوں؟ پان سڑا کیوں؟	جواب :	پھیرا نہ تھا ،
انار کیوں نہ چکھا؟ وزیر کیوں نہ رکھا؟	جواب :	دانا نہ تھا ،
گوشت کیوں نہ کھایا؟ ڈوم کیوں نہ گایا؟	جواب :	گلا نہ تھا ،
سنبوسہ کیوں نہ کھایا؟ جوتا کیوں نہ چڑھایا؟	جواب :	تلا نہ تھا ،
راجہ پیاسا کیوں؟ گدھا اداس کیوں؟	جواب :	لوٹا نہ تھا ،
دہی کیوں نہ جما؟ نوکر کیوں نہ رکھا؟	جواب :	ضامن نہ تھا ،
ستار کیوں نہ بجا؟ عورت کیوں نہ نہائی؟	جواب :	پردہ نہ تھا ،
دیوار کیوں ٹوٹی؟ راہ کیوں لوٹی؟	جواب :	راج نہ تھا ،
گھر کیوں اندھیارا؟ فقیر کیوں بُدارا؟	جواب :	دیا نہ تھا ،

نسبتیں

گوٹے اور آفتاب میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	کرن ،
آم یا شلجم اور کپڑے میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	جالی ،
گہنے اور درخت میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	پتّا ،
مکان اور پاجامے میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	موری ،
کپڑے اور دریا میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	پاٹ ،
بادشاہ اور مرغ میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	تاج ،
گھوڑے اور بزاز میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	تھان، زین ،
مکان اور کپڑے میں کیا نسبت ہے؟	جواب :	لٹھّا ،

انملیاں یا ڈھکوسلا

دال پکی کہ نہنگا سو رہوں ،

گوری کی نیناں ایسی بڑی جیسے بیل کے سینگ

کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا چلا آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اوروں کی چو پہری باجے چھوّ کی اٹھ پہری باہر کا کوئی آئے ناہیں، آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جا میں ناہیں تو سل اوروں کے جہاں سینگ سماوے چھوّ کے وال مو سل

دو سخنہ فارسی و ہندی

قوت روح چیست ؟ پیاری کو کب دیکھیے ؟ جواب : صدا، سدا
آواز ہمیشہ

تشنہ را چہ می باید ؟ ملاپ کو کیا چاہیے ؟ جواب : چاہ
کنواں، محبت

شکاری را چہ می باید ؟ مسافر کو کیا چاہیے ؟ جواب : دام
جال، روپیہ پیسہ

کوہ چہ می دارد ؟ مسافر کو کیا چاہیے ؟ جواب : سنگ
پتھر، ساتھ

در آئینہ چہ می بیند ؟ دکھیا کو کیا نہ کہیے ؟ جواب : رو
منہ ، گریہ وزاری

بسنت

دیآری موہے بھجو یارے   شاہ نجام کے رنگ میں
کپڑے رنگنے سے کچھ ناہوت ہے   یا رنگ میں میں نے تن کو ڈبو یارے
دیآری موہے ......
واہی کے رنگ سے سن وے شوخ رنگ   خوب ہی مل مل دھو یارے
پیر نجام کے رنگ میں بھجو یارے

ساون کا گیت

اماں میرے باوا کو بھجو جی کہ ساون آیا

بیٹی تیرا بادا تو بڈھاری   کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھجو جی   کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالاری   کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھجو جی   کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکاری   کہ ساون آیا

آنکھوں کا نسخہ

لودھ پھٹکری مُردہ سنگ   ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر، مرچیں چار   اُرد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی ٹپلی کرے   ترّت پیڑ نینوں کی ہرے

چیستان فارسی

ابر

چیست آں جانور کہ جانش نیست   خندہا می کند دہانش نیست
گریہا می کند ، نہ دارد چشم   نعرہا می زند زبانش نیست

آنبہ (آم)

کودکے دیدم عجب درکشورِ ہندوستاں   پوستش برموئے باشد موئے او بر اُستخواں

بُھٹّا

پیر مردے لطیف ریش سفید   کردہ دندانِ سرخ چوں گلنار
ہفت کرتہ بدارد او برتن   بایکے کرتہ می رود در نار

ترازو

یکے اسپے عجب دیدم کہ شش پاؤ دو دُم دارد   عجائب ترازیں بشنو میان پُشت دُم دارد

تربُز

آں چیست کہ روز می نماید شبگوں   صد بارہ تنش ولے بیک پائے نگوں
گر دست زنی بروز اندازہ بروں   ہمچوں دل عاشقاں ہمی ریزد خوں

تمباکو

چیست آں برگے کہ بعد از سوختن گل می شود   دود او اندر ہوا پیچیدہ سنبل می شود

تیر

عجب یک جانور دیدم دہاں بالائے سر دارد   بپایش کفشِ فولادی بروئے خود سپر دارد

جھاڑو

فرخ آں خادم کمر بستہ   یک تن است و ہزار سر دارد
سر خدمت بر آستاں بنہد   از رخش خاک راہ بردارد

چراغ

گلُے دیدم کہ او بے خار باشد   نہ در صحرا نہ در گلزار باشد
کسے اورا خرید و نے فروشد   ولے در تختۂ بازارِ باشد

خربُزہ

چہ چیز است آں کہ باشد گرد غلطاں   دو نام زندہ دارد لیک بے جاں
خرے باشد کہ ایں معنی نہ فہمد   ز بزُ کمتر بود آں مرد ناداں

قلم

بے سر کلنگ دیدم نے جو خورد نہ گندم   آبے خورد ز دریا فیضش رسد بمردم

بوجھ پہیلیاں

آری:

ایک نار وہ دانت دنتیلی   پتلی دُبلی چھیل چھبیلی
جب وا تریا کو لاگے بھوک   سوکھے ہرے چباوے روک
جو کوئی بتاوے واکے بلہاری   خسرو کہے ورے کو آری

آگ:

پون چلت وہ دیہہ بڑھاوے   جل پیوت وہ جیو گنواوے
ہے وہ پیاری سندر نار   نار نہیں پر ہے وہ نار

آئینہ:

فارسی بولی آئی نا   ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولوں آرسی آئے   خسرو کہے کوئی نہ بتائے

چھتری:

گھوم گھمیلا لہنگا پہنے ایک پاؤں سے رہے کھڑی   آٹھ ہاتھ ہیں اس ناری کے صورت اس کی لگے پری
سب کوئی اس کی چاہ کرے ہیں، گبرو مسلماں ہندو چھتری   خسرو نے یہ کہی پہیلی ۔ دل میں اپنے سوچ ذری

لوٹا:

گول مول اور چھوٹا موٹا   ہر دم وہ تو زمیں پہ لوٹا
خسرو کہے یہ نہیں ہے چھوٹا   جو نا بوجھے عقل کا کھوٹا

موری :

ساون بھادوں بہت چلت ہے ماگھ پوس میں تھوڑی   امیر خسرو یوں کہے تو بوجھ پہیلی موری

ناخن

ہاڑ کی دیہی ، اُجّل رنگ   لپٹا رہے ناری کے سنگ
نا مارا ناخون کیا   وا کا سر کیوں کاٹ لیا

ناؤ

جل جل چلتا بستا گاؤں   بستی میں ناوا کا ٹھاؤں
خسرو نے دیا وا کا ناؤں   بوجھو ارتھ نہیں چھاڑو گاؤں

نقّارہ

نر ناری کی جوڑی دیٹھی   جب بولے تب لاگے میٹھی
اک نہائے ، اک تاپن ہارا   چل خسرو کر کوچ نقارہ

بن بوجھ پہیلیاں

آدم :

بدھنا نے اک پرکھ بنایا   تریا دی اور نیر لگایا
چوک بھئی کچھ داسے ایسی   دیس چھوڑ بھیو پردیسی

آسمان :

ایک تھال موتیوں سے بھرا   سب کے سر پہ اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے   موتی اس سے ایک نہ گرے

آم :

ایک پُرکھ جب در پر آئے   لاکھوں ناری سنگ لپٹائے
جب وہ ناری مد پر آئے   تب وہ ناری نر کہلائے

آنکھ :

آوے تو اندھیری لائے   جاوے تو سُکھ لے جائے

آئینہ :

کیا جانوں وہ کیسا ہے   جیسا دیکھوں ویسا ہے
ادھٹ تو اس کا بوجھے گا   منہ دیکھو تو سوجھے گا

ابرو:

سیام برن اِک ناری،   ماتھے اوپر لاگے پیاری
جو مانس اس ارتھ کو کھولے   کتے کی وہ بولی بولے

بانسری:

بانس بریلی سے اک ناری   آئی اپنی بند کٹاری
پی کچھ اُس کے کان میں پھونکی   بولی وہ سن پی کے منھ کی
آہ پیا یہ کیسی کینی   آگ برہ کی بھڑکا دینی

بتّی چراغ:

ایک راجہ کی انوکھی رانی   نیچے سے وہ پیوے پانی

بُھٹّا (مکّا):

اک ترور کا پھل ہے تر   پہلے ناری پیچھے نر
وا پھل کی یہ دیکھو چال   باہر کھال اور بھیتر بال

پان،

ایک گنی نے یہ گن کینا   ہریل پنجرے میں دے دینا
دیکھو جادوگر کا حال   ڈالے ہرا نکالے لال

پسینہ:

دھوپوں سے وہ پیدا ہووے، چھاؤں دیکھ مرجھائے   اے ری سکھی میں تجھ سے پوچھوں ہوا لگے مرجائے

پھوٹ:

کھیت میں اپجے سب کوئی کھائے   گھر میں ہووے، گھر کھا جائے

جال :

تانا بانا جل گیا، جلا نہیں اک تاگا　　گھر کا چور پکڑ گیا، گھر موری میں سے بھاگا

شکر قند :

موٹا پتلا سب کو بھاوے　　دو مٹھیوں کا نام دھراوے

شمع :

اک ناری کے سر پر نار　　پی کی لگن میں کھڑی لاچار
سیس دھنے اور چلے نہ زور　　رو رو کر وہ کرے ہے بھور

کنکوا :

ایک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت　　بنا پروں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

★★★★★

امیر خسرو اپنے خیالات کی جدّت اور شعروں کی کثرت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ امیر خسرو کو ہر صنف سخن کی مہارت حاصل تھی۔ آپ ذہین، قابل اور صاحب علم و فضل ہونے کے علاوہ ، ایک صوفی بھی تھے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیا کے خاص مرید تھے اور آپ کو اپنے مرشد کا بھرپور پیار بھی ملا تھا۔ ان کی زندگی وجدان اور سرور و کیف میں بسر ہوتی تھی۔ موسیقی اور گانے میں بھی آپ کا جواب نہیں تھا۔ خدا نے آپ کو ایک فنکار اور مہذّب انسان کی تمام صفات سے نوازا تھا۔ درحقیقت امیر خسرو جیسے عجیب و غریب انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو سرتاپا محبت ہوں۔

سید غلام سمنانی (پیدائش ۷، جولائی ۱۹۳۴ء، جون پور) اردو اور انگریزی کے شاعر اور ادیب ہیں۔ آپ کی ترجمہ کردہ اے۔ ایل۔ باشم کی کتاب "ونڈرز دیٹ واز انڈیا" کو "ہندوستان کا شاندار ماضی" کے نام سے ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا ہے۔ آج کل آپ اپنا اردو مجموعہ کلام "آشوب فردا" ترتیب دے رہے ہیں۔ آپ تصوّف سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اردو ، انگریزی ، فارسی اور عربی ادب پر آپ کی گہری نظر ہے اور ان ادبیات کا تقابلی مطالعہ آپ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ آپ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی) میں انگریزی ادب کے استاد ہیں۔ امیر خسرو پر آپ کی انگریزی کتاب بھی نیشنل بک ٹرسٹ سے ہی شائع ہوئی ہے۔

قیمت Rs. 9·75

نیشنل بک ٹرسٹ - انڈیا